# الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

صبر بے عملی نہیں ——————
صبر منصوبہ بند عمل کا دوسرا نام ہے

جنوری ۱۹۸۶
شمارہ ۱۱۰

# عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

## مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

| | |
|---|---|
| اللہ اکبر | 30/- |
| تذکیر القرآن جلد اوّل | 80/- |
| الاسلام | 25/- |
| مذہب اور جدید چیلنج | 25/- |
| ظہورِ اسلام | 25/- |
| احیاءِ اسلام | 20/- |
| پیغمبرِ انقلاب | 25/- |
| سوشلزم اور اسلام | 25/- |
| صراط مستقیم | 25/- |
| اسلامی زندگی | 20/- |
| اسلام اور عصر حاضر | 20/- |
| دین کیا ہے | 3/- |
| قرآن کا مطلوب انسان | 5/- |
| تجدید دین | 4/- |
| اسلام دینِ فطرت | 3/- |
| تعمیرِ ملت | 3/- |
| تاریخ کا سبق | 4/- |
| مذہب اور سائنس | 5/- |
| عقلیاتِ اسلام | 3/- |
| فسادات کا مسئلہ | 2/- |
| انسان اپنے آپ کو پہچان | 2/- |
| تعارفِ اسلام | 3/- |
| اسلام پندرھویں صدی میں | 3/- |
| راہیں بند نہیں | 3/- |
| ایمانی طاقت | 4/- |
| اتحادِ ملت | 3/- |
| سبق آموز واقعات | 3/- |
| زلزلۂ قیامت | 5/- |
| حقیقت کی تلاش | 3/- |
| پیغمبرِ اسلام | 2/- |
| حقیقتِ حج | 4/- |
| آخری سفر | 3/- |
| اسلامی دعوت | 3/- |
| خدا اور انسان | 3/- |
| حل یہاں ہے | 3/- |
| سچا راستہ | 2/- |
| دینی تعلیم | 3/- |
| حیاتِ طیبہ | 3/- |
| باغِ جنت | 4/- |
| نارِ جہنم | 3/- |
| تبلیغی تحریک | 12/- |
| دین کی سیاسی تعبیر | 10/- |
| عقل کا فیصلہ | |
| کاروان اسلام | |
| رازِ حیات | |

| | |
|---|---|
| The Way to Find God | 4/- |
| The Teachings of Islam | 5/- |
| The Good Life | 5/- |
| The Garden of Paradise | 5/- |
| The Fire of Hell | 5/- |
| Muhammad: The Ideal Character | 3/- |

**مکتبہ الرسالہ** سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

# الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۰ جنوری ۱۹۸۶

## فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| ایک کردار | ۲ | کالی آگ | ۲۰ |
| زندگی کا امتحان | ۳ | صحابی کی مثال | ۲۱ |
| اسلام ختم نہیں ہوتا | ۴ | ایمان | ۲۲ |
| اصل رکاوٹ | ۶ | الحاد | ۲۳ |
| پیدائشی مسلم | ۷ | حدیث دعا | ۲۵ |
| تبلیغی طاقت | ۸ | علم | ۲۶ |
| تعارف اسلام | ۹ | کمپیوٹر | ۲۷ |
| تعمیر خویش | ۱۰ | دو تصویریں | ۲۸ |
| قربانی | ۱۱ | مانع جرم | ۲۹ |
| لچک بھی ضروری ہے | ۱۲ | ناگزیر برائی | ۳۰ |
| ایک عام برائی | ۱۳ | حکمتِ اسلام | ۳۱ |
| تضاد | ۱۴ | نسخ کی حقیقت | ۳۷ |
| دریا کے بغیر پل | ۱۵ | اسلوب کلام | ۴۱ |
| پل صراط کا منظر | ۱۷ | خبر نامہ اسلامی مرکز۔۱۵ | ۴۴ |
| جہیز کے بارہ میں | ۱۸ | ایجنسی الرسالہ | ۴۸ |

# ایک کردار

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ. وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ. ذَّٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

(الاعراف ۷۶ - ۱۷۵)

اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان کو چھوڑ کر نکل بھاگا۔ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان نشانیوں کی بدولت اس کا رتبہ بلند کر دیتے۔ مگر وہ زمین کا ہو رہا اور اس نے اپنی خواہش کی پیروی کی۔ تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا، تم اس پر بوجھ لادو تب بھی ہانپے اور چھوڑ دو تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں جھٹلایا۔ پس تم ان احوال کو بیان کرو شاید کہ وہ غور کریں۔

اللہ تعالیٰ ایک شخص کے لیے ایسے حالات برپا کرتا ہے کہ وہ حق کا اعتراف کرے اور پھر اعترافِ حق کا انعام پائے مگر اس کی خودی اس کے لیے اعتراف کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے سامنے ایسے مواقع کھولتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس میں استعمال کرے اور خدا کے دین کا خادم بنے مگر وہ اپنی سطحی خواہشات سے ایسا مغلوب ہوتا ہے کہ ان مواقع کو استعمال نہیں کر پاتا۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے سامنے ایسے دروازے کھولتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو کر اپنی اصلاح کرے اور نیک اعمال کر کے خدا کی رحمت و مغفرت کا مستحق بنے، مگر اپنے جھوٹے تقاضوں کی اہمیت اس کے ذہن پر اس طرح چھاتی ہے کہ وہ اس دروازہ میں داخل نہیں ہوتا یا داخل ہوتا ہے تو اپنی نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے جلد ہی اس سے نکل بھاگتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی عقل پر ان کی خواہشات نے غلبہ پالیا۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔ وہ دروازہ کھولے جانے سے پہلے بھی محروم تھے اور دروازہ کھولے جانے کے بعد بھی وہ محروم رہے۔

# زندگی کا امتحان

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ وہ آدم کے آگے جھک جائے۔ مگر شیطان آدم کے آگے نہیں جھکا۔ اس نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں (انا خیر منہ) پھر میں کمتر کے آگے کیوں جھکوں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا کردار فرشتوں کا تھا جو حکم ہوتے ہی فوراً آدم کے سامنے جھک گیے۔

آدم کی پیدائش کے وقت مذکورہ واقعہ کا پیش آنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ یہی معرکہ تمام انسانوں کے ساتھ پیش آئے گا۔ اس طرح تخلیق انسانی کے آغاز ہی میں یہ بتا دیا گیا کہ تمہارا اصل امتحان کہاں ہونے والا ہے۔ انسان کو موجودہ دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس کی بڑائی کا بت ٹوٹے پھر بھی وہ اس کو گوارا کرے۔ دوسرے کے مقابلے میں اس کو چھوٹا مقام ملے پھر بھی وہ اس پر راضی ہو جائے۔ اس کے احساس برتری کو کچلا جائے پھر بھی وہ حق و انصاف کے راستے سے نہ ہٹے۔ اس کی عظمت کا قلعہ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈھایا جائے پھر بھی وہ اس کا استقبال کرے۔

زندگی ایک ایسا امتحان ہے جس میں بار بار آدم کی مذکورہ کہانی دہرائی جاتی ہے یہاں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی بڑائی ٹوٹتی ہے۔ ایک شخص کو دوسرے شخص کے مقابلہ میں کم تر مقام پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اب جو لوگ ایسے مواقع پر اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی ہو جائیں وہ فرشتوں کے ہم نشیں قرار پاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی بڑائی کا بت ٹوٹنا برداشت نہ کریں اور اس "آدم" کے آگے جھکنے پر راضی نہ ہوں جس کو اللہ نے ان کے مقابلے میں بڑائی دی تھی وہ شیطان کے بھائی ہیں۔ ان کے لیے آخرت میں وہی انجام مقدر ہے جو ان کے پیش رو ابلیس کا ہونے والا ہے۔

زندگی ایک ایسا معرکہ ہے جس میں جیتے جی اپنے کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ جس میں خود اپنے ہاتھ سے اپنی قبر بنا کر اس میں لیٹ جانا پڑتا ہے۔ زندگی ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے کا امتحان ہے۔ جو لوگ اس ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے پر راضی ہوں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کے ان باغوں میں جگہ پائیں گے جو ہر قسم کی ناخوشگوار یوں سے پاک ہو، جہاں دوبارہ کچھ بھی برداشت نہ کرنا پڑے۔ جہاں انسان کو ہمیشہ کے لیے آزادی اور خوشی کی لامحدود دنیا حاصل ہو جائے۔

# امکان ختم نہیں ہوتا

عبدالرحمٰن بن معاویہ ابن ہشام (۱۷۲-۱۱۳ھ) بنو امیہ کا ایک شہزادہ تھا۔ وہ نہایت ذہین اور باصلاحیت تھا۔ چنانچہ اس کی تربیت ابتدا ہی سے نہایت شاہانہ انداز میں کی گئی۔ اس کو اس طرح تیار کیا گیا کہ جب وہ بڑا ہو تو کامیابی کے ساتھ تخت خلافت پر بیٹھ سکے۔

مگر ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی خلافت ختم ہو کر بنو عباس کی خلافت شروع ہو گئی۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ جب عباسی لشکر شام میں داخل ہو کر دمشق پر قابض ہو گیا اور بنو امیہ کا قتل عام ہونے لگا اس وقت اتفاق سے عبدالرحمٰن دمشق میں موجود نہ تھا۔ بلکہ باہر دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے اس کی جاگیر تھی اور اس کے باغات وغیرہ تھے۔ اس وقت وہ یہیں پر مقیم تھا۔

عبدالرحمٰن کو جب معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے افراد کا قتل عام ہو رہا ہے تو وہ یہاں درختوں کے جھنڈ میں خیمہ لگا کر چھپ گیا۔ ایک روز وہ اپنے خیمہ میں تھا کہ اس کا چار سال کا لڑکا خوف زدہ حالت میں خیمہ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ بنو عباس کے سپاہی اس کو تلاش کرتے ہوئے اس باغ تک پہونچ گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے اپنے بچہ کو گود میں اٹھایا اور دریا کی طرف بھاگا۔ وہ دریا میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اس کے دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ دمشق سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم کئی سال تک اس کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی رہی۔ دشمن سے بچنے کے لیے دریا میں کودنا، جنگلوں میں پناہ لینا، بھوکے پیاسے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگنا، یہ اس کی زندگی تھی۔ اسی حال میں وہ سبطہ پہونچا جو افریقہ کے ساحل پر واقع تھا۔

بظاہر عبدالرحمٰن کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی بنتے بنتے بگڑ گئی تھی۔ بچپن کی عمر میں جس کا یہ حال تھا کہ تخت خلافت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جوانی کی عمر کو پہونچ کر اس کے لیے زمین میں ایک گوشہ بھی نہیں رہا جہاں وہ سکون کی زندگی گزار سکے۔

مگر مایوسی کی آخری حد پر پہونچ کر اس کے لیے امید کی روشنی پیدا ہوگئی۔ عین اسی زمانہ میں اندلس کے مسلمان بے سردار ہو کر آپس میں لڑ رہے تھے۔ دمشق کے مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دمشق اور قرطبہ کے درمیان ایک پیغام کے آنے جانے میں اکثر مہینوں لگ جاتے تھے۔ اسی بنا پر اندلس کے اوپر دمشق کی مضبوط گرفت باقی نہیں رہی تھی۔

اندلس کے یہ حالات عبدالرحمٰن بن معاویہ کے لیے ایڈوانٹج بن گیے۔ وہ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے اندلس پہونچا۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک سردار کی ضرورت تھی۔ عبدالرحمٰن اپنی شخصی قابلیت نیز بنو امیہ کا ولی عہد ہونے کی وجہ سے بہت جلد وہاں کے لوگوں کا مرجع بن گیا اور بالآخر اس نے اندلس میں مضبوط مسلم سلطنت قائم کی۔ یہی امیر عبدالرحمٰن اندلس کی علمی اور تہذیبی ترقیوں کا بانی ہے۔ وہ شخص جس کی تاریخ دمشق میں ختم ہو چکی تھی اس نے اپنی حوصلہ مندی کی بنا پر قرطبہ میں اپنی ایک نئی شاندار تاریخ بنالی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی کے لیے امکان ختم نہیں ہوتا۔ جہاں ایک موقع ختم ہو وہیں دوسرا زیادہ بہتر موقع اس کے لیے موجود رہتا ہے۔ جب ایک تار اختتام پر پہونچتی ہے تو وہیں دوسری تاریخ کے آغاز کے امکانات شروع ہو جاتے ہیں۔

مگر نئے امکانات کبھی اپنے آپ واقعہ نہیں بنتے۔ ان کو استعمال کر کے انھیں واقعہ بنانے کے لیے ایک حوصلہ مند انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی ہمت نہ کھوئے، اگر وہ نئی جدوجہد کی ضروری شرطیں پوری کرنے کے لیے تیار ہو تو اس کے لیے ناکامی کا سوال نہیں۔ یہ دنیا خدا نے اسی لیے بنائی ہے کہ آدمی یہاں جدوجہد کر کے کامیاب ہو۔ اب جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اپنی نادانیوں سے ناکام ہوتا ہے، وہ خود اپنی کوتاہیوں کی سزا بھگتتا ہے۔

"انسان کے لیے کبھی امکان ختم نہیں ہوتا" یہ جملہ اتنا ہی بامعنی ہے جتنا یہ کہنا کہ "اس دنیا میں کبھی صبح کا آنا بند نہیں ہوتا"۔ جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا آنا یقینی ہے اسی طرح ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کامیابی کا دور آنا یقینی ہے۔ تاہم رات کے بعد نئی صبح لانے کے لیے زمین و آسمان کو عظیم گردش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح کسی آدمی کی زندگی میں ناکامی کے بعد کامیابی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اس کی خاطر عظیم جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

# اصل رکاوٹ

کہا جاتا ہے کہ اسلامی دعوت کے حق میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلامی اعمال والے لوگ نہیں۔ عام انسان صرف مثال کے ذریعہ انقلابی تاثر قبول کرتا ہے نہ کہ علمی بحثوں اور عقلی دلیلوں کے ذریعہ۔ مگر ہماری بے بسی یہ ہے کہ ہم مدعو سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ـــــ دیکھو یہ ہے اسلامی انسان، دیکھو یہ ہے اسلامی گھرانا، دیکھو یہ ہے اسلامی جماعت۔

یہ بات بظاہر نہایت درست معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ آدھی صداقت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس قول کی کوئی قیمت نہیں جس کے ساتھ عمل کی مطابقت شامل نہ ہو۔ اس اعتبار سے داعی کو بلاشبہ باعمل ہونا چاہیے۔ مگر یہ نہایت سادگی کی بات ہوگی کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ داعی اگر باعمل ہو تو تمام لوگ فوج در فوج اس کے ساتھی بن جائیں گے۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام انبیاء اپنے عمل کے اعتبار سے معیاری انسان تھے۔ وہ بلاشبہ مثالی کردار کے حامل تھے۔ پھر کیا ان نبیوں کو دیکھ کر سارے لوگ جوق در جوق ان کے مومن بن گیے۔ قرآن بتاتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ تمام نبیوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کر دیا۔ کردار و عمل کی تمام خوبیوں کے باوجود وہ ان کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے (یٰسٓ ۳۰)

حقیقت یہ ہے کہ سچائی کو اختیار کرنے میں اصل رکاوٹ داعی کا عمل نہیں بلکہ مدعو کی مفاد پرستی ہے۔ داعی کی بات کو ماننے کے لیے لوگ اس لیے تیار نہیں ہوتے کہ اس کی بات ماننے سے لوگوں کی بڑائی ختم ہوتی ہے۔ ان کی انا کا بُت ٹوٹتا ہے۔ ان کے مفادات اور مصلحتوں کا تانا بانا منتشر ہوتا ہے۔ اپنی بنی بنائی زندگی کو توڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشہ پر زندگی کی تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ خاندانی روابط، سماجی تعلقات اور قومی بندھنوں کا سارا ڈھانچہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ خود پرست ہیں، اس لیے وہ خدا پرست بننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور یہی حق کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر ایسا ہوا کہ نسلِ انسانی کے سب سے بہتر اور مثالی افراد (انبیاء علیہم السلام) کا بھی لوگوں نے اعتراف نہیں کیا، بلکہ حقارت کے ساتھ ان کو نظر انداز کر دیا۔

# پیدائشی مسلم

گاری ملر (Garry Miller) ایک امریکی عیسائی تھے۔ وہ ایک کالج میں بائبل کے ٹیچر تھے۔ ۱۹۷۸ میں ان کو یہ خیال ہوا کہ قرآن کو پڑھ کر دیکھیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے قرآن اور بائبل کا تقابلی مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اوپر اسلام کی حقانیت منکشف ہوگئی اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کا اسلامی نام عبدالاحد عمر ہے۔ وہ اب اپنی نومسلم بیوی کے ساتھ کناڈا میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو مذہب بدلنے والا (Convert) کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ اپنے آپ کو واپس آنے والا (Revert) کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے بلکہ میں اپنے پیدائشی مذہب کی طرف واپس آیا ہوں:

I haven't converted to Islam but merely reverted to my birthright religion
*Muslim Journal* Chicago, June 21, 1985

مذکورہ نومسلم نے جو بات کہی وہ بے حد اہم ہے۔ اور عین قرآن وسنت کے مطابق ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا ہے (الروم ۳۰) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا خدا کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے (کُلّ مولودٍ یولد علی الفطرۃ) اس اعتبار سے ہر آدمی پیدائشی مسلم ہے۔ خدا کے کارخانے سے وہ مسلم ومومن بن کر آتا ہے۔ اس کے بعد اس کی قومی روایات اور اس کے ماحول کے اثرات اس کو کسی اور مذہب پر ڈال دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلامی دعوت کا کام حقیقۃً لوگوں کے مذہب کو بدلنا نہیں ہے بلکہ ان کے اوپر پڑے ہوئے مصنوعی غلاف کو ہٹا دینا ہے۔ اگر ہم ایسا کرسکیں کہ انسان کے اوپر پڑے ہوئے خارجی غلاف کو ہٹا دیں تو اس کے بعد جو انسان بچے گا وہ وہی ہوگا جس کو مومن کہا جاتا ہے۔

ہر آدمی حقیقت کے اعتبار سے مومن ہے، اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے وہ کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کی یہ فطرت اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم امدادی قوت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کے سینہ میں دین حق کا ایک مثنیٰ موجود ہے۔ آدمی کا اندرونی شعور خود اس بات کی تصدیق کررہا ہے کہ یہی حق ہے اور اس کو اپنی چیز سمجھ کر اسے اختیار کرلینا چاہیے۔

# تبلیغی طاقت

قرآن میں ایک مضمون دو مقامات پر بیان ہوا ہے۔ یہاں ہم دونوں آیتیں نقل کرتے ہیں :

اولم یروا انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب (الرعد ۴۱)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ اور اللہ فیصلہ کرتا ہے۔ کوئی اس کے فیصلے کو پیچھے ڈالنے والا نہیں۔ اور وہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

افلا یرون انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها افھم الغالبون (الانبیاء ۴۴)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ کیا پھر بھی وہی غالب آنے والے ہیں۔

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کے اکابر اور سرداروں نے آپ کو رد کر دیا۔ انھوں نے آپ کے ساتھیوں کو بہکایا۔ آپ کے بارہ میں بے بنیاد پروپیگنڈے کیے۔ آپ کی معاشیات کو تباہ کیا۔ آپ کو اپنے قبیلہ کی حمایت سے محروم کیا۔ آپ پر جارحانہ حملے کیے۔ آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔

قریش خوش تھے کہ انھوں نے یہ سب کر کے پیغمبر اسلام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انھوں نے آپ کے "مسئلہ" کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ عین اس وقت یہ کہا گیا کہ تمہارا یہ بے بنیاد خیال صرف اس لیے ہے کہ تمہاری آنکھیں صرف قریب کے حالات کو دیکھ رہی ہیں، دور کے احوال کی تمہیں خبر نہیں۔

عین اس وقت جب کہ قریش اسلام کا جغرافی دائرہ تنگ کر رہے تھے، اس کا نظریاتی دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر روز شرک کے حلقہ سے کچھ افراد نکل کر اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے۔ قریش اسلام کے مادی جغرافیہ کو تنگ کر کے خوش ہو رہے تھے مگر اسلام کی تبلیغی طاقت خود قریش کے نظریاتی جغرافیہ کو تنگ کر رہی تھی۔ اور تجربہ نے ثابت کیا کہ پہلی طاقت کے مقابلہ میں دوسری طاقت زیادہ موثر ہے۔

دعوت و تبلیغ سب سے بڑی طاقت ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

# تعارف اسلام

دہلی کی جامع مسجد کے پاس تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ایک لائبریری ہے۔ مجھے مسز اینی بسنٹ کی ایک کتاب کی تلاش تھی۔ اس کتاب کو لینے کے لیے میں مذکورہ لائبریری میں ۲۴ جون ۱۹۷۹ کو گیا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول اس دن ان کا ہفتہ وار اجتماع تھا۔ کتاب حاصل کرنے کے بعد دن کو ۱۰ بجے میں ان کے اجتماع میں شریک ہوگیا۔ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع تھا۔ نیا چہرہ دیکھ کر انھوں نے مجھ سے فرمائش کی "آپ بھی اپنے وچار رکھیں"۔ میں نے کہا کہ میں قرآن کا طالب علم ہوں اگر آپ پسند کریں تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ یہ بتاؤں کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے، انھوں نے کہا۔ ضرور۔ آپ یہی بتلائیے۔ ہم آپ سے اسی موضوع پر سننا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس تقریر میں سادہ انداز میں توحید، آخرت اور جنت و جہنم کی وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ قرآن کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ موجودہ دنیا کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا مسئلہ ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم کس طرح زندگی گزاریں کہ ہماری اگلی زندگی کامیاب رہے۔ تمام لوگ بہت غور سے میری تقریر سنتے رہے۔ تقریر کے بعد سوالات بھی ہوئے جن کا میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع سے ایک صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرا پتہ معلوم کیا۔ میں نے اپنا پورا پتہ بتا دیا۔ انھوں نے کہا کہ پٹیل نگر (نئی دہلی) میں تھیاسوفیکل سوسائٹی کا لاج ہے۔ وہاں زیادہ بڑے پیمانہ پر ہمارا پروگرام ہوتا ہے۔ ہم وہاں پر آپ کی تقریر رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہم ایک ساتھ ایک مہینہ (چار ہفتہ وار اجتماعات) کا پروگرام بنا کر چھپوا لیتے ہیں اور اس کو تمام ممبروں تک بھیج دیتے ہیں۔ اب ۱۵ جولائی تک ہمارا پروگرام سٹ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کسی تاریخ کو ہم آپ کو زحمت دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد میری دوسری تقریر ۱۵ جولائی ۱۹۷۹ کو ہوئی۔ اس کا عنوان تھا، قرآن کا پیغام۔ ملک کے اکثر حصوں میں غیر مسلم حضرات کے اس طرح کے اجتماعات برابر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی وہاں آئیں اور سنجیدہ انداز میں اپنی بات پیش کریں۔ اسلام کے تعارف کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس کے سلسلہ میں ایک کام یہ بھی ہے کہ اس طرح کے اجتماعات میں پہونچیں اور ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں۔

# تعمیرِ خویش

اللہ تعالیٰ نے لکڑی پیدا کی مگر اس نے کشتی نہیں بنائی۔ اس نے لوہا زمین میں رکھ دیا مگر اس نے لوہے کو مشین کی شکل میں نہیں ڈھالا۔ اس نے المونیم اور پلاسٹک پیدا کیا مگر ان کو جہاز کی صورت میں تشکیل دینے کا کام چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا کام اللہ تعالیٰ انسان سے لینا چاہتا ہے۔ اللہ نے ایک طرف ہر قسم کے خام مواد پیدا کیے۔ اور دوسری طرف انسان کو عقل کی صلاحیت عطا فرمائی۔ اب اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ انسان زمین سے خام مواد لے کر اس کو مشین کی صورت دے۔ وہ بغیر گھڑے ہوئے مادہ کو گھڑے ہوئے مادہ میں تبدیل کرے۔

یہ فطرت کی قوتوں کو تمدن میں ڈھالنے کی مثال ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک بہترین شخصیت عطا فرمائی۔ فطرت کی سطح پر اس کو اعلیٰ ترین وجود عطا فرمایا۔ تاہم یہ انسانی شخصیت اپنی ابتدائی صورت میں ایک قسم کا خام مواد ہے۔ اب یہ کام خود انسان کو کرنا ہے کہ وہ خدا کے دیے ہوئے اس ابتدائی وجود کی تشکیل نو کرے۔ وہ فطرت کے سادہ ورق پر اپنا کلام تحریر کرے۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ اسی معاملہ میں کامیابی یا ناکامی پر اس کے مستقبل کا انحصار ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے شعور کو معرفت میں ڈھالے۔ اپنے احساسات کو ذکر الٰہی میں تبدیل کرے۔ وہ اپنے عمل کو ربانی کردار کی صورت میں ظاہر کرے۔ وہ اپنی شخصیت کو آخری حد تک خدا کا بندہ بنا دے۔

ایک انسان وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کو ہر شخص اپنے آپ بناتا ہے۔ آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے گویائی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اب کوئی انسان اپنی گویائی کو حق کے اعتراف کی طرف لے جاتا ہے اور کوئی حق کے انکار کی طرف۔ آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے اعلیٰ صلاحیت لے کر موجودہ دنیا میں آتا ہے۔ اب کوئی شخص اس صلاحیت کو فوری فائدے کے حصول میں لگاتا ہے اور کوئی اس کو اعلیٰ مقصد کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ ہر آدمی فطرت کی ایک زمین ہے۔ کوئی اپنی زمین پر کانٹے اگاتا ہے اور کوئی ہے جو اپنی زمین کو پھولوں کا باغ بنا دیتا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو جنت کا باشندہ بناتا ہے اور کوئی جہنم کا باشندہ۔

# قربانی

درخت کیا ہے۔ ایک بیج کی قربانی۔ ایک بیج جب اپنے کو فنا کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے تو اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک سرسبز و شاداب درخت زمین پر کھڑا ہو۔

اینٹوں سے اگر آپ پوچھیں کہ مکان کس طرح بنتا ہے تو وہ زبان حال سے یہ کہیں گی کہ کچھ اینٹیں جب اس کے لیے تیار ہوتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن کر دیں، اس کے بعد وہ چیز ابھرتی ہے جس کو مکان کہتے ہیں۔

یہی حال انسانی زندگی کی تعمیر کا ہے۔ انسانیت کے مستقبل کی تعمیر اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اپنے کو بے مستقبل دیکھنے پر راضی ہو جائیں۔ ملت کی ترقی اس وقت ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ جانتے بوجھتے اپنے کو بے ترقی کر لیں ——— قربانی کے ذریعہ تعمیر، یہ قدرت کا ایک عالمگیر قانون ہے اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قدرت کا یہی اصول مادی دنیا کے لیے بھی ہے اور قدرت کا یہی اصول انسانی دنیا کے لیے بھی۔

عمارت میں ایک اس کا گنبد ہوتا ہے، اور ایک اس کی بنیاد۔ گنبد ہر ایک کو دکھائی دیتا ہے مگر بنیاد کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ کیوں کہ وہ زمین کے اندر دفن رہتی ہے۔ مگر یہی نہ دکھائی دینے والی بنیاد ہے جس پر پوری عمارت اور اس کا گنبد کھڑا ہوتا ہے۔ قومی تعمیر کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قربانی یہ ہے کہ آدمی قومی تعمیر میں اس کی بنیاد بننے پر راضی ہو جائے۔

قربانی یہ نہیں ہے کہ آدمی جوش میں آکر لڑ جائے اور اپنی جان دے دے۔ قربانی یہ ہے کہ آدمی ایک نتیجہ خیز عمل کے غیر مشہور حصہ میں اپنے کو دفن کر دے۔ وہ ایسے کام میں اپنی کوشش صرف کرے جس میں دولت یا شہرت کی شکل میں کوئی قیمت ملنے والی نہ ہو۔ جو مستقبل کے لیے عمل کرے نہ کہ حال کے لیے۔

کسی قوم کی ترقی اور کامیابی کا انحصار ہمیشہ اسی قسم کے افراد پر ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کسی قوم کے مستقبل کی بنیاد بنتے ہیں۔ وہ اپنے کو دفن کر کے قوم کے لیے زندگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

# لچک بھی ضروری ہے

دکان دار کے یہاں ایک آدمی آیا۔ اس کو کپڑا خریدنا تھا۔ کپڑا اس نے پسند کر لیا مگر دام کے لیے تقریباً آدھ گھنٹہ تک تکرار ہوتی رہی۔ نہ دکاندار کم کرنے پر راضی ہوتا تھا نہ خریدار بڑھانے پر۔ آخر دکاندار نے اسی قیمت میں کپڑا دے دیا جس پر گاہک اصرار کر رہا تھا۔

ایک بزرگ اس وقت دکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب گاہک چلا گیا تو انھوں نے کہا: جب تمہیں گاہک کی لگائی ہوئی قیمت پر کپڑا دینا تھا تو پہلے ہی دے دیا ہوتا۔ آخر اتنی دیر تک اس کا اور اپنا وقت کیوں ضائع کیا۔ "حضرت آپ سمجھے نہیں" دکاندار نے کہا "میں اس کو پکا کر رہا تھا۔ اگر میں اس کی لگائی ہوئی قیمت پر فوراً سودا دیدیتا تو وہ شبہ میں پڑ جاتا اور خریدے بغیر واپس چلا جاتا۔ اس کے علاوہ میں یہ اندازہ کر رہا تھا کہ وہ کہاں تک جا سکتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ اس سے آگے بڑھنے والا نہیں ہے تو میں نے اس کو کپڑا دے دیا۔

جب دو فریقوں کے درمیان مقابلہ ہو تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی مرضی کے مطابق معاملہ طے کرانا چاہتا ہے۔ ایسے موقع پر بلاشبہ عقل مندی کا تقاضا ہے کہ اپنی مانگ پر اصرار کیا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ عقل مندی ہی کا دوسرا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی اپنی حدود کو جانے اور اس کے لیے تیار رہے کہ بالآخر کہاں پہونچ کر اس کو راضی ہو جانا ہے۔

اس اصول کو ایک لفظ میں توافق (Adjustment) کہہ سکتے ہیں۔ یہ توافق زندگی کا ایک راز ہے۔ یہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا اہم ترین اصول ہے۔ اس اصول کی اہمیت ذاتی معاملات کے لیے بھی ہے اور قومی معاملات کے لیے بھی۔

اس اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جاننے کے ساتھ دوسروں کو بھی جانے۔ موجودہ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو دو طرفہ تقاضوں کی رعایت کر سکے۔ جو شخص یک طرفہ طور پر صرف اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑے اس کے لیے موجودہ دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

# ایک عام برائی

یزید کی فوجوں سے حضرت حسین کی جو لڑائی کربلا کے میدان میں ہوئی، اس میں حضرت حسین کے ساتھ ان کے چار فرزند بھی مارے گیے تھے۔ مگر شیعہ مصنفین کی کتابوں میں حضرت حسین کی شہادت کے ذیل میں صرف ان کے ایک صاحبزادے کا ذکر آتا ہے جن کا نام عباس بن علی تھا۔ بقیہ تین صاحبزادوں کے نام سرے سے ذکر نہیں کیے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نام حضرت علی نے خلفاء ثلاثہ کے نام پر رکھے تھے جن کو شیعہ حضرات جائز خلیفہ نہیں مانتے۔ یعنی ان کے نام تھے ——— ابوبکر بن علی، عمر بن علی، اور عثمان بن علی۔

اپنی پسند کے ناموں کو تاریخ میں شامل کرنا اور جو نام پسند نہ ہوں ان کو تاریخ سے حذف کر دینا صرف شیعہ حضرات کا جرم نہیں ہے۔ اس میں سُنّی حضرات بھی یکساں طور پر شریک ہیں۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ کے سنّی حضرات تو اس میں اتنا زیادہ مبتلا ہیں کہ شاید ہی کوئی مثال اس کے خلاف مل سکے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صحافت و قیادت کو دیکھیے۔ وہ واضح طور پر اسی صورت حال کی مثال ہے۔ وہ اپنے پسندیدہ لوگوں کے نام ہر جگہ شامل کرتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر ان کی تشہیر کرتے ہیں مگر جو ان کے مبغوض نام ہیں ان کو اس طرح نظر انداز کرتے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

ایسا کرنا حقیقت کو قتل کرنا ہے۔ اور حقیقت کا قتل بلاشبہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں۔

خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ جس چیز کو ایمان کہتے ہیں وہ حقیقت واقعہ کے اعتراف ہی کا دوسرا نام ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی کسی مجبوری کے بغیر خود اپنے اختیار سے خدا کی عظمت کو مان لے۔ انسان کی یہی وہ اعلیٰ ترین صفت ہے جس کو نفسیات کی زبان میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کہا جاتا ہے۔ جنّت کی لطیف دنیا میں وہی لوگ بسائے جائیں گے جو اس اعلیٰ خصوصیت کا ثبوت دیں۔ اس کے برعکس جو لوگ حقیقت واقعہ کو چھپائیں یا اس کا اقرار نہ کریں وہ جنّت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے نااہل ٹھہریں گے۔

# تضاد

یہ ایکسپریس ٹرین کا فرسٹ کلاس تھا۔ ایک مرد عورت اپنے بچہ کے ساتھ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے وہاں پہلے سے ایک آدمی تھا جو سگریٹ پی رہا تھا۔ مرد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا :

I think smoking is not allowed inside the compartment

(میرا خیال ہے کہ کمپارٹمنٹ کے اندر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں) اس کے بعد میاں بیوی دونوں ایک طرف بیٹھ گیے اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ بچہ سے مل کر زور زور سے باتیں کرنے اور قہقہہ لگانے میں مشغول ہو گیے۔ ان کے نزدیک کمپارٹمنٹ کے اندر "دھواں" کرنا ناجائز تھا مگر اسی کمپارٹمنٹ کے اندر "شور" کرنا ان کے نزدیک عین درست تھا۔

یہی آج کل تمام انسانوں کا حال ہے۔ ایک آدمی اتفاق سے جس چیز کا عادی نہیں ہے یا جو چیز اتفاق سے اس کی عادت میں شامل نہیں ہوئی ہے اس کا بُرا ہونا اس کو معلوم ہے۔ وہ کسی شخص کو اس میں مشغول دیکھتا ہے تو بہت زور و شور کے ساتھ اس کے غلط ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ مگر اسی درجہ کی دوسری برائی جس میں وہ آدمی خود مبتلا ہے وہ اس کو نظر نہیں آتی، حتیٰ کہ اس کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ غلط ہے۔ وہ دوسرے کی برائی کا خوب ذکر کرتا ہے مگر وہ اپنی برائی کے بارہ میں خاموش رہتا ہے۔

برائی کی ایک قسم اور ہے جو اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اور وہ ہے ——— خود را فضیحت دیگراں را نصیحت۔ یعنی دوسروں کو برا کہنا اور خود اُسی بُرائی میں مبتلا ہونا۔ ایک آدمی دوسرے کو دورُخا (Double standard) ہونے کا الزام دے گا حالاں کہ وہ خود دورُخا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کی اقربا نوازی کے خلاف جھنڈا اٹھائے گا حالاں کہ اپنے دائرہ میں وہ خود اقربا نوازی کر رہا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کو اتحاد دشمن بتلائے گا حالاں کہ وہ خود اتحاد دشمنی کے عمل میں مبتلا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کی مصلحت پرستی کا انکشاف کرے گا حالاں کہ وہ اپنے مفاد کے معاملہ میں خود بھی مصلحت پرست بنا ہوا ہوگا۔

لوگ تضاد میں جی رہے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ خدا کی دنیا ہے۔ اور خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کا رویہ اتنا بڑا جرم ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔

# دریا کے بغیر پُل

سابق روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچیف نے کہا تھا: سیاست داں ہر جگہ ایک ہی قسم کے ہیں۔ وہ ایک پُل بنانے کا وعدہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ وہاں سرے سے کوئی دریا موجود نہ ہو۔

Politicians are the same all over. They promise to build a bridge even where there is no river.

دنیا دار لیڈروں کی یہ سیاست خود مسلم لیڈروں میں بھی پوری طرح آگئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا دار لیڈر اپنے عوام کی پسندیدہ زبان بولتے ہیں اور مسلم لیڈر مسلمانوں کی نفسیات کے اعتبار سے اپنے لیے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ایک دنیا دار لیڈر اگر کہے گا کہ "جنتا راج لاؤ" تو مسلم لیڈر کا نعرہ ہوگا "قرآنی حکومت قائم کرو" مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیوں کہ دونوں جگہ صرف نعرے ہیں۔ جنتا راج ہو یا قرآنی راج، دونوں ہی کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ سماج میں اس کے موافق زمین تیار کی جائے۔ مگر دونوں ہی زمین تیار کیے بغیر لاؤڈ اسپیکر پر الفاظ کا طوفان برپا کر رہے ہیں۔ "پُل" کی باتیں ہو رہی ہیں جب کہ "دریا" کا ابھی کوئی وجود ہی نہیں۔

مسلم ملکوں میں عوام کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ پاکستان اور ایران میں شہوانی فلموں پر پابندی لگائی گئی تو لوگوں نے کیسٹ کے ذریعہ وی سی آر پر فلموں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اور رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ اپنے ملک کے "ظالموں" کو مٹانے کے لیے تمام مسلم لیڈر ایک محاذ پر متحد ہو جاتے ہیں۔ مگر ظالم کے ہٹنے کے بعد ہی ان کا "بے نظیر اتحاد" ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اقتدار کے لیے خود آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس معاشرہ میں عوام و خواص کا یہ حال ہو وہاں جلسے اور جلوس کی سیاست سے اسلامی نظام کس طرح قائم ہو جائے گا۔

کام کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے بنیاد تعمیر کی جائے۔ قوم کو باشعور بنایا جائے۔ اس کے اندر کردار پیدا کیا جائے۔ اس کے مختلف طبقوں کو متحد کیا جائے۔ وہ ذرائع فراہم کیے جائیں جو موجودہ زمانہ میں کوئی موثر کام کرنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے لیڈر اس قسم کا بنیادی کام نہیں کرتے۔ وہ اوّل دن سے بڑے بڑے اقدام کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ صرف لیڈری کی تعمیر ہے نہ کہ ملت کی تعمیر۔

# Magnetic wire that trips up thieves

Shoplifting is big business: petty thieves around the world filch billions of dollars of goods each year. But a new disposable antitheft "tag" that is virtually impossible to detect may cause some pilferers to think about switching pastimes. The tag, made by Knogo Corp. of Hicksville, N.Y., consists of a hairthin magnetic wire that can be attached to anything from a jar of caviar to a pack of cigarettes.

Unlike the bulky plastic antitheft tags frequently used to protect clothing, Knogo's minuscule Electro Thred tags are nearly invisible. The metal thread can be attached to a price tag, incorporated into a mock bar-code label or glued to the seam of a can or the side of a carton during manufacture. When a customer makes a purchase a clerk deactivates the tag by passing the item over a desensitizing device. (Unlike plastic antitheft tags, the Electro Thred tag does not have to be removed; it is simply deactivated.) Shoplifters making off with an item containing a "live" Electro Thred wire will be tripped up at the door, where a detector sounds an alarm.

Supermarkets and pharmacies may find Knogo's invisible threads attractive because they offer broad antitheft protection at a relatively low price. Electro Thred tags cost less than one cent apiece if purchased in volume. Because the tags are hard to see, they don't have to be attached to every item in a store to deter thieves. Retailers can tag only expensive or easily stolen items and leave shoplifters guessing whether the rest are bugged. Knogo encourages clerks to run every purchase through the deactivator to "give the impression to shoppers that all items are protected," says company engineer Michael Cooper.

The system is not flawless. Clerks must bring each tag into physical contact with the deactivator to ensure that the Electro Thred is desensitized; this means shop employees must be trained to recognize which items are tagged and where tags are located. Since about one-third of the thefts in many stores are attributed to what retailers call "internal shrinkage" — pilferings by employees — training the shop clerks to recognize selectively tagged items may only cause added problems. Still, Knogo's system may convince some light-fingered individuals to keep their hands off the goods. The electro Thred system is being marketed in the United States, Europe, Japan and Australia. Knogo plans to bring out a similar antitheft system for libraries next year.

JULITH JEDAMUS WITH CYNTHIA CATTERSON

*NEWSWEEK*/November 4, 1985

# پل صراط کا منظر

دنیا بھر میں چور کروروں ڈالر کا سامان دکانوں سے اٹھا لیتے ہیں۔ اس کو روکنے کے لیے نیویارک کی ایک فرم نے ایک کامیاب طریقہ دریافت کیا ہے، یہ چوری روک تکہ ہے۔ یہ ایک قسم کا مقناطیسی تار ہے جو بال کی طرح باریک ہوتا ہے۔ وہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا اور کسی بھی سامان کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ جب ایک خریدار سامان کو باقاعدہ خریدتا ہے تو دکان کا ایک کلرک اس کو ایک خاص طرح کی مشین سے گزار کر اس کو غیر موثر بنا دیتا ہے۔

نیویارک کے میگزین نیوز ویک (۴ نومبر ۱۹۸۵) میں یہ خبر دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ چوری سے دکان کا سامان اٹھانے والا آدمی جب ایک ایسا سامان اٹھاتا ہے جس میں مذکورہ قسم کا زندہ برقی تار لگا ہوا ہو تو وہ دروازہ پر پہونچتے ہی پکڑ لیا جاتا ہے جہاں ایک مشین اس کو محسوس کر لیتی ہے اور فوراً الارم کی شکل میں اس سے آگاہ کر دیتی ہے:

> Shoplifters making off with an item containing a live Electro Thread wire will be tripped up at the door, where a detector sounds an alarm.

مذکورہ خبر پڑھتے ہوئے مجھے وہ خبر یاد آگئی جو قیامت کے بارہ میں دی گئی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگ جہنم کے اوپر سے گزریں گے۔ پھر نیک لوگ بچ جائیں گے اور برے لوگ جہنم میں گرا دیئے جائیں گے (مریم ۷۱) حدیث کے مطابق اس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کے اوپر ایک پل (پل صراط) ہوگا۔ اس سے تمام لوگ گزارے جائیں گے۔ اس پل کے دونوں طرف فرشتے ہوں گے۔ ان کے پاس آگ کے آنکس ہوں گے۔ وہ اس سے انسانوں کو پکڑ کر کھینچ لیں گے اور ان کو دوزخ میں ڈال دیں گے (معهم كلاليب من نار يختطفون بها الناس، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۲)

آخرت کی دنیا ابھی انسان کے لیے نہ دکھائی دینے والی دنیا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو آج کی دنیا کے واقعات آئندہ آنے والی دنیا کے واقعات کو قابل فہم بنا رہے ہیں۔ وہ آج کے تجربہ کی صورت میں کل کے تجربہ کی جھلک دکھا رہے ہیں۔

# جہیز کے بارہ میں

شادی میں جہیز دینے کی رسم ہندستانی مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ رسم ہندستان اور پاکستان کے سوا دوسرے مسلم ملکوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں میں یہ رسم یقینی طور پر ہندوؤں سے آئی ہے۔ ہندو لوگ، اپنے قدیم قانون کے مطابق، بیٹی کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے تھے، اس کی تلافی کے لیے ان کے یہاں یہ رواج پڑ گیا کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو زیادہ سے زیادہ دیا جائے۔ چنانچہ وہ جہیز کے نام پر بیٹی کو اپنی دولت کا ایک حصہ دینے کی کوشش کرنے لگے۔

اسی ہندو طریقہ کی تقلید ہندستان کے مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ اسلام میں اگرچہ لڑکی کو وراثت میں باقاعدہ حصہ دار بنایا گیا ہے۔ مگر مسلمانوں نے عملی طور پر لڑکیوں کو اس شرعی حق سے محروم کر رکھا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے انھوں نے اس ہندو طریقہ کو اختیار کر لیا ہے کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو کافی سامان دے کر اسے خوش کر دیا جائے۔ جہیز حقیقۃً اسلام کے قانون وراثت سے فرار کی تلافی ہے جس کو پڑوسی قوم سے لے کر اختیار کر لیا گیا ہے۔

کچھ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ جہیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے کیا تو ان کو اپنے پاس سے جہیز بھی عطا کیا۔ اس قسم کی بات دراصل غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیا اس کو کسی طرح بھی "جہیز" نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر اس کو جہیز کہا جائے تو ساری دنیا میں غالباً کوئی ایک مسلمان بھی نہیں جو اپنی لڑکی کو یہ پیغمبرانہ جہیز دینے کے لیے تیار ہو۔

وہ جہیز کیا تھا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو دیا۔ یہاں ہم اس کی روایت نقل کرتے ہیں:

اخرج البیهقی فی الدلائل عن علی انه قال جهز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمة فی خمیل وقربة و وسادة ادم حشوها اذخر (کنز العمال جلد ۷، صفحہ ۱۱۳)

حضرت علی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو جہیز میں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ دیا جس میں اذخر گھاس کا بھراؤ تھا

واضح ہو کہ حدیث میں جہز کا لفظ معروف قسم کا جہیز دینے کے معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ ضروری چیزوں کا انتظام کرنے کے معنی میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام خود حضرت علیؓ کی رقم پر کیا تھا۔ یہ رقم حضرت علی نے اپنی ایک پرانی زرہ فروخت کر کے آپ کے حوالے کی تھی۔

مزید یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہاں حضرت فاطمہ کے علاوہ تین اور صاحبزادیاں تھیں جو بڑی ہوئیں اور پھر بیاہی گئیں۔ مگر مذکورہ "جہیز" آپ نے صرف حضرت فاطمہ کو دیا۔ بقیہ صاحبزادیوں کو اس قسم کا کوئی جہیز نہیں دیا۔ اگر جہیز فی الواقع آپ کی مستقل سنت ہوتی تو آپ نے بقیہ صاحبزادیوں کو بھی ضرور جہیز دیا ہوتا۔ مگر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتا کہ آپ نے بقیہ صاحبزادیوں کو بھی "جہیز" دیا ہو۔

یہ فرق خود ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ جہیز، اگر اس کو جہیز کہا جا سکے، بربنائے ضرورت تھا نہ کہ بربنائے رسم۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی جب چھوٹے تھے اسی وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد (ابو طالب) سے کہہ کر ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ حضرت علی بچپن سے آپ کی زیر کفالت تھے۔ گویا حضرت علی ایک اعتبار سے آپ کے چچازاد بھائی تھے اور دوسرے اعتبار سے آپ کے بیٹے کے برابر تھے۔ بچپن سے آپ کے تمام اخراجات کی فراہمی آپ کے ذمہ تھی۔ اس لیے بالکل قدرتی بات تھی کہ نکاح کے بعد نیا گھر بسانے کے لیے آپ انھیں بطور سرپرست کچھ ضروری سامان دے دیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام ایک ناقص دین ہے، اس میں زندگی کے تمام معاملات کے بارہ میں احکام موجود نہیں۔ تو مسلمان ایسے شخص سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ مگر عملاً مسلمان اسی بات کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ اسلام ایک ناقص دین ہے، یا کم از کم یہ کہ اس کی ہدایات کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کے طریقے زیادہ بہتر اور زیادہ قابل عمل ہیں۔

جہیز کے بارہ میں مسلمانوں نے واضح طور پر ہندو طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کی دوسری رسوم جو مسلمانوں میں رائج ہیں وہ اسلام سے زیادہ دوسری قوموں کے طور طریقوں سے ماخوذ ہیں۔ اگر مسلمانوں کا یہ خیال ہو کہ اسلام کے کامل دین ہونے پر فخر کرنا ہی خدا کے یہاں ان کی مقبولیت کے لیے کافی ہے تو اس سے بڑی غلط فہمی اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر فخر کرتے تھے اس کے باوجود وہ خدا کے یہاں ملعون قرار دیدیئے گئے۔

# کالی آگ

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اُوقِدَ علی النار الف سنۃ حتیٰ احمرّت ثم اُوقِدَ علیھا الف سنۃ حتیٰ ابیضّت ثم اوقِد علیھا الف سنۃ حتیٰ اسودّت فھی سوداءُ مظلمۃ

(الترمذی)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم کی آگ کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ لال ہوگئی۔ اس کے بعد پھر اس کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ سفید ہوگئی۔ پھر اس کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ کالی ہوگئی۔ اب وہ گہری کالی ہے۔

جہنم کی آگ حقیقتہً کیا ہے اور کس طرح بھڑکتے بھڑکتے کالی ہوگئی ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ مگر آگ کا کالا ہو جانا آج کے انسان کے لیے ناقابل فہم نہیں رہا۔ آج کے علم الافلاک نے بتایا ہے کہ کائنات میں آگ کی ایسی دنیائیں ہیں جو اپنی شدت کے آخری مرحلے میں پہونچ کر کالی ہوگئی ہیں "کالی آگ" آج کے انسان کے لیے ایک معلوم چیز ہے اور اس کو جدید اصطلاح میں کالا غار (Black hole) کہا جاتا ہے۔

فلکیاتی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بہت بعید فاصلوں پر کائنات میں انتہائی بڑے بڑے ستارے (آگ کے گولے) ہیں۔ وہ اتنے بڑے ہیں کہ کہکشاں کے مقابلہ میں سوگنا زیادہ انرجی خارج کرتے ہیں جب کہ ایک کہکشاں میں کھرب ہا کھرب ستارے ہوتے ہیں۔ ابتدائیہ ستارے اسی طرح "روشن" دکھائی دیتے تھے جیسے دوسرے ستارے۔ نظریہ یہ ہے کہ اپنی بڑھی ہوئی قوتِ کشش کی وجہ سے ان ستاروں نے اپنے مادہ کو اندر کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اس کے نتیجہ میں ستارہ سکڑتا گیا اور جتنا سکڑتا گیا اتنا ہی اس کی قوت اور زیادہ بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی قوت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ روشنی بھی اس سے خارج نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح انتہائی روشن ہونے کے باوجود اب وہ ہماری نظر کے لیے بالکل تاریک ہوگیا ہے۔ کیوں کہ آدمی اپنی موجودہ آنکھوں سے کسی ایسی ہی چیز کو دیکھ سکتا ہے جس کی روشنی اس کی آنکھوں تک پہونچ رہی ہو۔

غیبی چیزوں کا حقیقی علم انسان کو صرف اگلی دنیا میں ہو سکے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں بھی ایسی چیزیں رکھ دی ہیں جو غیبی حقیقتوں کو ہمارے لیے قابل فہم بنا سکیں۔

# صحابی کی مثال

اخرج ابو نُعَیم فی الحلیۃ عن ثابت البُنانی قال: خطب یزید بن معاویۃ الیٰ ابی الدرداء رضی اللہ عنہ ابنتہ الدرداء۔ فردّہ۔ فقال رجل من جلساء یزید اصلحک اللہ تأذن لی أن اتزوجھا۔ قال اغرب ویلک۔ قال فاذن لی اصلحک اللہ۔ قال نعم۔ قال فخطبھا فانکحھا ابو الدرداء الرجل۔ قال فسار ذلک فی الناس ان یزید خطب الیٰ ابی الدرداء فردّہ۔ وخطب الیہ رجل من ضعفاء المسلمین فانکحہ۔ فقال فقال ابو الدرداء، انی نظرت للدرداء، ماظنکم بالدرداء اذا قامت علی رأسھا الخصیان ونظرت فی بیوت یلتمع فیھا بصرھا، این دینھا منھا یومئذ

ابو نُعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ثابت بُنانی سے نقل کیا ہے کہ یزید بن معاویہ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے یہاں ان کی لڑکی دردار کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت ابو الدرداء نے اس کو رد کر دیا اس وقت یزید کے یہاں بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ تمہارا بھلا کرے، تم مجھے اجازت دو کہ میں اس سے نکاح کر لوں۔ یزید نے کہا۔ دور ہو، تمہارا ناس ہو جائے۔ اس آدمی نے دوبارہ کہا کہ مجھے اجازت دو، اللہ تمہارا بھلا کرے۔ یزید نے کہا بہت اچھا۔ راوی کہتے ہیں کہ اس آدمی نے پیغام دیا تو حضرت ابو الدرداء نے اس سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا کہ یزید نے ابو الدرداء کو پیغام دیا تو انھوں نے رد کر دیا اور کمزور مسلمانوں میں سے ایک شخص نے پیغام دیا تو انھوں نے اس سے نکاح کر دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابو الدرداء نے یہ سن کر کہا: میں نے اس معاملہ میں دردار کا لحاظ کیا۔ دردار کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے، جب اس کے سرہانے خصی غلام کھڑے ہوتے اور وہ ایسے گھروں کو دیکھتی جس میں اس کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں۔ اس میں اس وقت اس کا دین کہاں رہ جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مومن کو اپنی اولاد کے معاملہ میں کیسا ہونا چاہیے۔ مومن کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ اپنی اولاد کے دین وایمان کی حفاظت کرے۔ وہ ان کے دنیا کے مستقبل سے زیادہ ان کے آخرت کے مستقبل کے لیے فکرمند ہو۔

# ایمان

علمار اسلام نے ایمان کی پانچ قسمیں کی ہیں :

| | |
|---|---|
| الایمان المطبوع وھو ایمان الملائکۃ | نقش کیا ہوا ایمان اور وہ فرشتوں کا ایمان ہے۔ |
| والایمان المعصوم وھو ایمان الانبیاء | معصوم ایمان اور وہ پیغمبروں کا ایمان ہے۔ |
| والایمان المقبول وھو ایمان المومنین | مقبول ایمان اور وہ مومنین کا ایمان ہے۔ |
| والایمان الموقوف وھو ایمان المبتدعین | موقوف کیا ہوا ایمان اور وہ بدعتی لوگوں کا ایمان ہے۔ |
| والایمان المردود وھو ایمان المنافقین | رد کیا ہوا ایمان اور وہ منافقین کا ایمان ہے۔ |

اس قسم کی فنی تقسیم بہت زیادہ غلط فہمی پیدا کرنے والی ہے۔ بظاہر اس تقسیم میں ہر بات بیان ہوگئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو اصل بات ہے وہی اس میں غیر مذکور یا کم از کم غیر واضح ہے اور وہ ہے عارف کا ایمان۔

ایمان کی اصل قسم وہ ہے جس کو معرفت یا دریافت کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ وہ کائنات میں غور کرتا ہے۔ وہ قرآن و سنت کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ اس پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہاں ایک خالق و مالک ہے۔ وہ ذاتی دریافت کے طور پر معلوم کرتا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور محمد بن عبد اللہ خدا کے سچے رسول ہیں۔

یہ ایمان جو کسی آدمی کو بطور دریافت حاصل ہوتا ہے یہ اتنی بڑی حقیقت ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کو کسی خانہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ لامحدود خدا کا مشاہدہ ہے پھر کوئی محدود زبان کیونکر اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ یہ ابدی حقیقت کا انکشاف ہے پھر اس کو وقتی اصطلاحوں میں کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ محسوسات سے ماورا ہستی کا ادراک ہے پھر اس کو محسوسات کے دائرہ میں کیسے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسی چیز جس کا تعلق گہرے معنوی حقائق سے ہو اس کو فنی الفاظ میں بیان کرنا ہمیشہ ایک نقصان کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اس میں وہی بات بیان ہونے سے رہ جاتی ہے جو کہ اصل بات ہے۔ اس میں وہی بات مذکور نہیں ہوتی جس کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہیے۔

# الحاد

قرآن میں گمراہی کی جو صورتیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک الحاد ہے۔ الحاد کے معنی انحراف یا نشانہ سے ہٹنے کے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں الحد السھم الھدف (تیر نشانہ کے ایک جانب لگا) اسی مناسبت سے بغلی قبر کے لیے لحد یا ملحود کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن میں یہ مادہ چار مقام پر استعمال ہوا ہے۔

۱۔ سورہ اعراف میں ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اللہ کے نام میں الحاد کرتے ہیں۔ (وذروا الذین یلحدون فی اسمائه۔ ۱۸۰) خدا کے نام میں الحاد کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کو جسمانی نام دیئے جائیں۔ خدا نے خود اپنے کچھ نام بتائے ہیں۔ مثلاً رحمان، رحیم وغیرہ۔ مگر جن لوگوں پر حسیت کا غلبہ ہو وہ خدا کو محسوس پیکر میں ڈھالنے کے لیے اس کا کوئی جسمانی نام رکھ لیتے ہیں۔

قدیم عرب کے بڑے بڑے بُت اسی اصول پر خدا کے جسمانی نام تھے۔ انھوں نے خدا کے سچے ناموں میں "انحراف" کر کے کچھ نئے نام بنالیے اور خود ساختہ بتوں کو یہ نام دے کر کہا کہ یہ بُت خدا سے الگ نہیں ہیں بلکہ اس کا محسوس اظہار ہیں:

ای اترکوا الذین یمیلون فی اسمائه تعالیٰ عن الحق کما فعل المشرکون حیث اشتقوا لآلھتھم اسماء منھا کاللات من اللّٰہ والعزیٰ من العزیز ومناۃ من المنّان (صفوة التفاسیر)

یعنی ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اللہ کے ناموں میں حق سے انحراف کرتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کے مشرکوں نے کیا۔ انھوں نے خدا کے ناموں سے اپنے بتوں کے نام نکالے۔ مثلاً لات اللہ سے اور عزّیٰ عزیز سے اور منات منّان سے۔

۲۔ سورہ نحل میں الحاد کا لفظ ان لوگوں کے ذیل میں آیا ہے جو یہ کہتے تھے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ محمدؐ نے بعض عجمی غلاموں سے سیکھ کر اس کو تصنیف کرلیا ہے (انھم یقولون انما یعلمه بشر لسان الذی یلحدون الیه اعجمی وھذا لسان عربی مبین۔ ۱۰۳) یعنی وہ بات کو صحیح اور سچے رُخ سے موڑ کر غلط رُخ پر لے جا رہے ہیں۔ جس کلام کو خدا کی طرف منسوب کرنا چاہیے اس کو انسان کی طرف منسوب کرتے ہیں (والمعنی یمیلون قولھم عن الصدق والاستقامة

الیہ ، التفسیر المظہری)

۳۔ سورہ حم السجدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں (ان الذین یلحدون فی آیاتنا لایخفون علینا۔ ۴۰) اس سے مراد قرآنی آیتوں کی تاویل میں انحراف ہے۔ یعنی وہ آیات کو حق سے موڑ دیتے ہیں۔ اور دلیلوں کو غلط رُخ دے کر طعن و تشنیع کرتے ہیں (یمیلون عن الحق فی ادلتنا بالطعن ، تفسیر النسفی)

۴۔ سورہ حج میں کہا گیا ہے کہ جو شخص شرارت کی وجہ سے مسجد حرام میں ٹیڑھی راہ نکالے گا اس کو ہم سخت سزا دیں گے (ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم۔ ۲۵) یعنی جو شخص مسجد حرام میں کوئی برائی چاہے گا یا سیدھے طریقہ سے انحراف کرے گا یا کسی معصیت کا قصد کرے گا تو اس کو ہم شدید قسم کا عذاب دیں گے (ای ومن یرد فیہ سوءاً او میلاً عن القصد او یہم بمعصیۃ نذقہ اشد انواع العذاب ، صفوۃ التفاسیر)

الحاد ، قرآن کے مطابق ، یہ ہے کہ آدمی بظاہر دین کا لفظ بولے مگر غلط تاویل سے اس کے رُخ کو بے رخ کر دے۔ اس کو خدا اور رسول کے مطلوب مفہوم میں لینے کے بجائے کسی خود ساختہ مفہوم میں لینے لگے۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ ذاتی حکم کو اجتماعی حکم بنا دے۔ ایک حکم جس کا رُخ آدمی کی اپنی طرف ہو ، اس کو پھیر کر وہ دوسروں کی طرف کر دے۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے : وربك فكبّر وثيابك فطهّر (اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے اخلاق کو پاک کر) اب آدمی اگر یہ کرے کہ وثیابك فطهّر کو وثیاب غیرك فطهّر کے معنی میں لے لے اور دوسروں کے اوپر اخلاقی داروغہ بن کر کھڑا ہو جائے تو یہ مذکورہ آیت میں الحاد کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

اسی طرح "اللہ بڑا ہے" ، بلاشبہ اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ مگر وہ اس وقت گمراہی بن جاتی ہے جب کہ آدمی اس میں الحاد کر کے اس کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ وہ اس کا حوالہ دے کر اپنے سیاسی حریفوں کو گرانے اور اکھاڑنے میں لگ جائے۔ "اللہ بڑا ہے اس لیے میں بڑا نہیں ہوں" ، کہنا قرآن کی تعلیم کو صحیح رُخ سے لینا ہے۔ "اللہ بڑا ہے اس لیے تم بڑے نہیں ہو" کا نعرہ لگانا قرآن کی تعلیم کو غلط رُخ سے لینا ہے۔

# حدیثِ دعا

| | |
|---|---|
| ان الدعاء ھو العبادۃ (احمد) | دعا ہی عبادت ہے۔ |
| الدعاء مخ العبادۃ (ترمذی) | دعا عبادت کا مغز ہے۔ |
| من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (ترمذی) | جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے |
| لایرد القضاء الا الدعاء (ترمذی) | قضا کو صرف دعا ہی ٹال سکتی ہے۔ |
| مامن احدٍ یدعوا بدعاءٍ الا اتاہ اللہ ماسأل اوکف عنہ من السوء مثلہ مالم یدع باثم اوقطیعۃ رحم (ترمذی) | کوئی شخص جب اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ یا تو اس کو وہ چیز دے دیتا ہے جو اس نے مانگی تھی یا اس کے برابر کوئی بلا اس سے روک دیتا ہے، جب تک کہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔ |
| لیس شئ اکرم علی اللہ من الدعاء (ابن ماجہ) | اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں |
| سلوا اللہ من فضلہ فان اللہ یحب ان یسال (ترمذی) | اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ کیوں کہ اللہ پسند کرتا ہے کہ اس سے مانگا جائے۔ |
| ان الدعاء ینفع مما نزل ومما لم ینزل فعلیکم عباد اللہ بالدعاء (احمد) | دعا ان چیزوں کے لیے بھی مفید ہے جو اُتر چکی ہیں اور ان چیزوں میں بھی جو ابھی نہیں اُتریں۔ تو اے اللہ کے بندو، تم ضرور دعا مانگو۔ |
| یسأل احدکم ربہ حاجتہ کلہ حتی یسال شسع نعلہ اذا انقطع (ترمذی) | تم میں سے ہر ایک کو اپنے رب سے اپنی تمام حاجت مانگنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی وہ خدا سے مانگے۔ |

دعا کرنے والا اپنے آپ کو عاجزِ مطلق کے مقام پر رکھتا ہے اور خدا کو قادرِ مطلق کے مقام پر۔ دعا ایک طرف اپنی حیثیتِ واقعی کا اقرار ہے اور دوسری طرف خدا کی حیثیتِ واقعی کا اعتراف۔ یہ حقیقت پسندی کی آخری شکل ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف سے بڑا کوئی عمل اس امتحان کی دنیا میں نہیں۔

# علم

العلماء ورثة الانبياء (حدیث)

علماء پیغمبروں کے وارث ہیں۔

اللّٰھم ارحم خلفائی۔ قلنا من خلفاؤك یارسول اللّٰہ۔ قال الذین یحفظون سنّتی ویعلّمونھا للناس (حدیث)

اے اللہ، میرے خلفاء پر رحم کر۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کون لوگ آپ کے خلفاء ہیں۔ آپ نے کہا کہ وہ لوگ جو میری سنت کی حفاظت کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

لیس شئ اعزّ من العلم۔ الملوك حكام على الناس والعلماء حكام على الملوك (ابو الاسود)

علم سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں۔ بادشاہ عوام پر حکومت کرتے ہیں اور علم والے لوگ بادشاہوں پر حکومت کرتے ہیں۔

عن عون بن عبداللّٰہ قال قلت لعمر بن عبدالعزیز یقال: ان استطعت ان تکون عالماً فکن۔ فان لم تستطع فکن متعلمًا۔ فان لم تکن متعلمًا۔ فاحبھم۔ فان لم تحبھم فلا تبغضھم۔ فقال عمر سبحان اللّٰہ لقد جعل اللّٰہ لہ مخرجًا

عون بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم عالم بن سکتے ہو تو بنو۔ اگر عالم نہیں بن سکتے تو طالب علم بنو۔ اگر تم طالب علم نہیں بن سکتے تو ان سے محبت کرو۔ اگر تم ان سے محبت نہیں کر سکتے تو ان سے بغض نہ رکھو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ سن کر کہا سبحان اللہ۔ اس کو خدا نے راستہ دیدیا۔

علامہ شاطبی نے لکھا ہے ——— مستحب، مندوب، فرض، اور مکروہ اور حرام کی جو تقسیمیں ہیں، تقرب الی اللہ اور تزکیۂ نفس کے سلسلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیوں کہ اصل مقصود تزکیۂ نفس ہے۔ جو چیز تزکیۂ نفس میں مدد دے وہی اہم ہے، چاہے وہ مستحب ہو یا فرض۔ اور جو برائی کی طرف لے جائے وہ ممنوع ہے، خواہ وہ مکروہ ہو یا حرام۔

شاطبی، الموافقات، التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ، جلد ۳ صفحہ ۲۴۱

افضل العلم الورع والتفکر (حسن بصری)

افضل علم پرہیزگاری اور غور و فکر ہے۔

# کمپیوٹر

۳ جون ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ امریکہ کے خلائی دفاعی کمانڈ NORAD کے اعلیٰ ترین کمپیوٹر نے تیزی سے یہ خبر دی کہ روس نے امریکہ پر حملہ کر دیا ہے۔ پہلے اس نے بتایا کہ روس کے دو تحت بحری میزائل (Submarine missiles) امریکہ کی طرف آرہے ہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ مزید کئی تحت بحری میزائل روس سے امریکہ کے نشانہ پر چل پڑے ہیں۔ حتیٰ کہ اس نے بتایا کہ روس کی طرف سے ایک مکمل آئی سی بی ایم حملہ کا آغاز ہو گیا ہے۔

A full scale Soviet ICBM launch had begun

اس خبر کے ملتے ہی امریکہ کے بہترین جنگی ہوابازوں نے (B-52 jets) کو سنبھال لیا۔ قریب تھا کہ امریکہ کی طرف سے اس کے خلاف مکمل جوابی حملہ شروع ہو جائے۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کمپیوٹر میں پروگرامنگ کی غلطی تھی۔

(گارجین (مانچسٹر)، ۷ جولائی ۱۹۸۵)

اس قصہ کی تفصیل درج کرتے ہوئے گارجین کے مضمون نگار نے لکھا ہے:

Just one small programming error could start world war three.

کمپیوٹر کے پروگرامنگ میں چھوٹی سی غلطی تیسری عالمی جنگ چھیڑ سکتی تھی۔

کمپیوٹر کے بارہ میں اس طرح کے لطیفے اکثر اخبارات میں آتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نصیحت لینا چاہے تو اس کو ان واقعات میں بہت بڑا سبق ملے گا۔

موجودہ زمانہ کے ملحدین نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کائنات ایک عظیم مشین ہے۔ یہ الفاظ گرامر کے اعتبار سے صحیح ہیں مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے سراسر بے معنی ہیں۔ کائنات اگر صرف ایک مشین ہو تو اس میں ہر روز اسی قسم کے حادثات پیش آنے چاہئیں جو کمپیوٹر کے نظام میں پیش آتے ہیں کائنات کا اس قسم کے حادثات سے خالی ہونا بتاتا ہے کہ وہ عظیم ذہن کی کارفرمائی ہے نہ کہ محض بے روح مشین کی کارفرمائی۔

# دو تصویریں

کہا جاتا ہے کہ شیخ بایزید بسطامی کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جب شیخ بایزید بسطامی کا انتقال ہو گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم اسلام کیوں نہیں قبول کر لیتے۔ یہودی نے کہا۔ میں اسلام کیسے قبول کروں۔ اگر اسلام وہ مذہب ہے جو شیخ بایزید بسطامی کا مذہب تھا تو وہ میرے بس میں نہیں اور اگر اسلام وہ مذہب ہے جو میں عام مسلمانوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے اسلام سے شرم آتی ہے۔

ایک غیر مسلم شیخ بسطامی جیسے بزرگوں میں جو مذہب دیکھتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی دنیا سے کٹ کر گوشہ میں معتکف ہو جائے۔ وہ مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے۔ وہ روزانہ کئی کئی بار قرآن ختم کرے۔ وہ سال بھر روزے رکھے۔ وہ حج کرنے جائے تو ہر قدم پر دو رکعت نفل پڑھے۔ وہ ذکر کے کچھ الفاظ یاد کر کے روزانہ کئی کئی لاکھ بار اس کا ورد کرے، وغیرہ

دوسری طرف عوام کے اندر جو اسلام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اسلام کا نام لے اور عملاً اپنی مرضی پر چلے۔ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے اور انسان کے سامنے اکڑ دکھائے۔ وہ قرآن کو بطور تلاوت پڑھے اور اپنی زندگی کو اس کے احکام سے آزاد رکھے۔ وہ اسلام کے دینِ کامل ہونے پر فخر کرے مگر اپنی حقیقی زندگی میں جزئی اسلام پر بھی قائم نہ ہو۔ وہ کریڈٹ ملنے والے مقامات پر اسلام کا جھنڈا اٹھائے اور جہاں بظاہر کریڈٹ نہ مل رہا ہو وہاں اسلام سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ قومی دین کو اپنا دین بنائے اور اس کے اوپر خدا کے دین کا لیبل لگا دے۔

اسلام ایک سادہ اور فطری دین ہے۔ وہ انسانی فطرت کے لیے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ اپنی اسی فطری کشش کی وجہ سے دورِ اول میں اسلام زمین کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسلام کی خود ساختہ شکلیں بن گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے لوگوں کی نظر میں اپنی کشش کھو دی۔

اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ باعتبار حقیقت وہ آج بھی اپنے اندر مکمل کشش رکھتا ہے۔ اگر اسلام کی حقیقی تصویر سے تمام مصنوعی پردے ہٹا دیئے جائیں تو اسلام اپنے آپ ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔

# مانع جرم

ایک مفکر کا قول ہے :

It is not the severity of punishment that acts as a deterrent. It is its inevitability.

یعنی سزا کی سختی آدمی کو جرم سے نہیں روکتی۔ یہ سزا کی ناگزیریت ہے جو مانع جرم کا کام کرتی ہے۔

یہ قول بہت بامعنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس قدر سرکش ہے کہ صرف سزا کا امکان اس کے لیے اتنا طاقتور محرک نہیں کہ وہ اس کو جرم سے روک دے۔ آدمی جرم سے صرف اس وقت رُکتا ہے جب کہ اس کو یقین ہو کہ اگر اس نے جرم کیا تو وہ کسی حال میں اس کے انجام سے بچ نہیں سکے گا۔

مثال کے طور پر ایک شخص جنگل میں بے ہتھیار چلا جا رہا ہے۔ اتنے میں وہ دیکھتا ہے کہ قریب کی جھاڑی میں ایک زندہ شیر موجود ہے۔ ایسے موقع پر وہ سانس روک لے گا اور نہایت آہستگی کے ساتھ آگے بڑھ جائے گا۔ کوئی بھی بے ہتھیار آدمی جنگل کے کھلے ہوئے شیر کو نہیں چھیڑتا۔ مگر یہی انسان جب انسانی بستی میں آتا ہے تو وہ دوسرے انسانوں کو چھیڑتا ہے۔

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو یقین ہے کہ اگر اس نے جنگل کے شیر کو چھیڑا تو اس کے بُرے انجام سے وہ بچ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس اپنے جیسے انسان کو چھیڑنے میں یہ اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہاں اس کو بھروسہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی تدبیر سے وہ اپنے آپ کو اس کے انجام سے بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

انسان کی یہ نفسیات بتاتی ہے کہ انسان کو جرم سے باز رکھنے کی صرف ایک ہی ممکن تدبیر ہے۔ وہ یہ کہ اس کے اندر اس حقیقت واقعہ کا یقین پیدا کیا جائے کہ اس کے اوپر ایک خدا ہے جو ہر آن اس کو دیکھ رہا ہے۔ آدمی کسی حال میں اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ انسانی قانون میں یہ ناگزیریت نہیں، اس لیے انسانی قانون پوری طرح مانع جرم نہیں بنتا۔ مگر خدائی قانون میں ناگزیریت ہے۔ اس لیے صرف اسی کے اندر یہ طاقت ہے کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رکھے۔

# ناگزیر برائی

مسٹر ڈی کے داس دہلی کے اعلیٰ ترین سرکاری افسران (Seniormost IAS officers) میں سے ایک تھے۔ دہلی کی ایک پوش کالونی "مدھوبن" میں ان کا بہت بڑا مکان تھا۔

مگر ۳ اگست ۱۹۸۵ کو انھوں نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔ ان کی اہلیہ مسز ہینا داس ایک بجے دن میں ان کے کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کا مردہ جسم چھت کے پنکھے سے بندھا ہوا لٹکا تھا۔ موت کے وقت مسٹر داس کی عمر ۵۶ سال تھی۔ وہ حال میں دہلی ٹورزم ڈولپمنٹ کارپوریشن کے چیرمین مقرر ہوئے تھے اور آئی اے ایس کے اسکیل کا آخری مشاہرہ پا رہے تھے۔ اس کے باوجود مسٹر داس نے کیوں خودکشی کرلی۔ اس سلسلہ میں ہم دو اخباروں کی رپورٹ سے چند جملے یہاں نقل کرتے ہیں۔ پہلا اقتباس ہندستان ٹائمس ۴ اگست کا ہے اور دوسرا ٹائمس آف انڈیا ۴ اگست کا ہے:

> A businessman friend of Mr Das said the deceased bureaucrat was dissatisfied with many of the postings he got. He said that Mr Das often used to say that he was always given insignificant and ordinary positions.
>
> He was also depressed because he felt that he was not being given his due in the Delhi administration.

مسٹر داس کے ایک تاجر دوست نے کہا کہ آنجہانی افسر اپنی کئی تقرری پر مطمئن نہ تھے۔ مسٹر داس اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کو ہمیشہ غیر اہم اور معمولی پوزیشن دی جاتی ہے۔ وہ غیر مطمئن بھی تھے کیوں کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن میں ان کو ان کی واجبی جگہ نہیں دی گئی ہے۔

اس دنیا میں کوئی شخص اقلیتی فرقہ کا ہو یا اکثریتی فرقہ کا، معمولی ملازم ہو یا اعلیٰ عہدیدار، ہر حال میں اس کو کہیں نہ کہیں امتیازی برتاؤ کا تجربہ ہوتا ہے۔ امتیاز اس دنیا کی ناگزیر برائی ہے۔ اس دنیا میں کوئی شخص اس احساس سے بچ نہیں سکتا کہ اس کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ ایسی حالت میں عقلمندی یہ ہے کہ اس صورت حال کو گوارا کیا جائے۔ کیوں کہ اس کو گوارا نہ کرنا آدمی کو یا تو مایوسی کی طرف لے جاتا ہے یا خودکشی کی طرف۔

# حکمتِ اسلام

حافظ ابوخیثمہ زہیر بن حرب النسائی (۱۶۰-۲۳۴ھ) نے اپنی "کتاب العلم" میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن ابی عبد الرحمٰن ان علیاً علیہ السلام مر بقاصٍّ فقال: اَتعرف الناسخ من المنسوخ۔ قال لا۔ قال هلكت و اهلكت (صفحہ ۳۱)

حضرت ابوعبدالرحمٰن عبد اللہ بن حبیب السلمی تابعی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو لوگوں کو جمع کرکے تقریر کررہا تھا۔ انھوں نے اس سے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ منسوخ کیا ہے اور ناسخ کیا۔ مقرر نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا تم خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ناسخ اور منسوخ کا لفظ یہاں اس محدود مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے جو موجودہ زمانہ میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس سے وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے جو کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم ہے۔ اس وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے داعی اور مصلح کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ ناسخ اور منسوخ کے معاملہ کو جانے۔ جو شخص ناسخ اور منسوخ کے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ نہ جانے وہ مصلح نہیں مفسد ہے۔ وہ اگر دعوت و اصلاح کے لیے اٹھتا ہے تو یقینی طور پر وہ خود بھی ہلاک ہوگا اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے کا ذریعہ بنے گا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ناسخ اور منسوخ کا تعلق چند مخصوص احکام سے ہے اور وہ ابدی ہے۔ مثلاً ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد سورہ بقرہ (رکوع ۱۷) کی آیات اتریں اور پچھلا حکم منسوخ ہوگیا اور کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ نسخ کے جو احکام ہیں وہ ابدی ہیں جو چیز منسوخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہے۔ اور جو چیز ناسخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے ناسخ ہے۔

مگر یہ خیال درست نہیں۔ ناسخ اور منسوخ کا معاملہ نہ تو چند خاص احکام سے متعلق ہے اور نہ وہ

غیر مبدل ہے۔ ناسخ اور منسوخ ایک مستقل شرعی اصول ہے۔ اس کا تعلق اس اہم چیز سے ہے جس کو عملی حکمت (Practical wisdom) کہا جاتا ہے۔ اور وہ پورے دین سے متعلق ہے نہ کہ محض چند احکام سے متعلق۔ اس اصول کے تحت کبھی ایک حکم میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شراب کے معاملہ میں کیا گیا۔ چنانچہ شراب کو تین مرحلہ میں حرام قرار دیا گیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حالات کی رعایت سے ایک طرح کا حکم مطلوب ہوتا ہے اور کبھی بدلے ہوئے حالات کے اعتبار سے دوسرا حکم مطلوب ہو جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ داعی کو یہ فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے تقاضوں کو وقت کے عملی حالات پر منطبق کرے۔ وہ لوگوں کو عین تقاضائے وقت کے مطابق صحیح دینی مشورہ دے۔ اب جو شخص ناسخ اور منسوخ، بالفاظ دیگر دین کی عملی حکمتوں اور مصلحتوں کو جانے گا وہی شخص لوگوں کو صحیح رہنمائی دے سکتا ہے۔ جو شخص دین کے حکیمانہ پہلو کو نہ جانے وہ دین کے نام پر بے دینی کی بات کرے گا۔ وہ لوگوں کو غلط راہوں میں دوڑانا شروع کر دے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی حکمتِ اسلام کا نہایت عظیم اور کامل نمونہ ہے۔ آپ نے مکہ میں صبر کے اصول پر عمل کیا اور مدینہ میں دفاع اور قتال کے اصول پر۔ یہ بھی نسخ ہی کا ایک معاملہ تھا۔ یعنی مکہ کے حالات کے تحت وہاں آپ کے لیے صبر کا حکم تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ کے حالات کے تحت صبر کا حکم منسوخ ہو گیا اور دفاع اور قتال کا حکم دے دیا گیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ صبر کا اصول ہمیشہ کے لیے متروک اور منسوخ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک اصولی حکم کے طور پر بدستور باقی ہے اور جب بھی اور جہاں بھی مکہ جیسے حالات پائے جائیں گے صبر کا حکم وہاں دوبارہ اسی طرح مطلوب ہو جائے گا جس طرح وہ ابتداءً مکی دور میں مطلوب تھا۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوہ اُحد میں مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا اور غزوۂ خندق میں مدینہ میں رہ کر مقابلہ فرمایا۔ بدر کے موقع پر آپ نے اپنے دشمنوں سے جنگ کی اور حدیبیہ کے موقع پر انھیں دشمنوں سے یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔ غزوۂ حمراء الاسد میں آپ نے اعلان و اظہار کے ساتھ سفر کیا اور فتح مکہ کے موقع پر کامل خاموشی کے ساتھ سفر کیا گیا۔ حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ایک انسانی گروہ کو دوسرے انسانی گروہ پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر اپنے بعد خلافت

کے لیے آپ نے ہدایت فرمائی کہ امیر المومنین صرف قبیلہ قریش میں سے بنایا جائے۔ ایک قسم کے باغیوں کے لیے قرآن میں آپ کو حکم دیا گیا کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اطاعت قبول کرلیں (تقاتلونھم اویسلمون) دوسری طرف آپ کی ہدایت کے مطابق خلیفہ سوم حضرت عثمان نے اپنے باغیوں کے خلاف ہاتھ نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ بلامقابلہ شہید ہوگیے۔ ایک طرف آپ نے فرمایا کہ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔ دوسری طرف آپ نے اپنے صحابہ کو شدت سے یہ تلقین کی کہ میرے بعد تمہارے اوپر ظالم حکمراں ہوں گے مگر تم ان کے خلاف جنگ نہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ

جو شخص دعوت و اصلاح کے کام کے لیے اٹھے اس کو ناسخ اور منسوخ کے اس شرعی حکم سے باخبر ہونا چاہیے۔ اس کو اس حکمت بالغہ کو اچھی طرح جاننا چاہیے جس کے تحت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک طرح کے حالات میں ایک طریقہ اختیار فرمایا، اور دوسری طرح کے حالات میں اس کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ پر عمل کیا۔

جو شخص اس راز سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود وہ خطیب اور قائد بن کر کھڑا ہو جائے وہ اصلاح کے نام پر صرف بگاڑ پیدا کرے گا۔ مثلاً وہ لوگوں کو ایک مسلم حکمراں سے ٹکراؤ پر ابھارے گا۔ جب کہ اسلام کا حقیقی تقاضا اس وقت یہ ہوگا کہ سیاسی ٹکراؤ سے الگ رہ کر کام کیا جائے۔ وہ ایک مسلم گروہ کو یہ مشورہ دے گا کہ وہ اپنی حریف قوم کو نقصان پہونچا کر اس سے اپنے لیے زندگی کا حق وصول کریں جب کہ اسلامی حکمت اس وقت یہ چاہتی ہوگی کہ حریف قوم کے لیے نفع بخش بن کر اس کے درمیان اپنے لیے عزت کی جگہ حاصل کی جائے۔

ایسا شخص مسلم نوجوانوں کو پرجوش طور پر تلقین کرے گا کہ تم خالد سیف اللہ بنو جب کہ حالات پکار رہے ہوں گے کہ مسلم نوجوانوں کو داعی الی اللہ بننے پر ابھارا جائے۔ وہ مسلمانوں کو اسلام پر فخر کرنا سکھائے گا جب کہ باعتبار واقعہ اصل ضرورت یہ ہوگی کہ مسلمانوں کے اندر تواضع والا اسلام پیدا کیا جائے۔ وہ اقدام و اظہار کی بات کرے گا جب کہ حالات کا تقاضا ہوگا کہ مسلمانوں سے وہ بات کہی جائے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں مطالبۂ اظہار پر حضرت عمر فاروق سے فرمائی تھی: یاعمر انا قلیل (اے عمر، ہم تھوڑے ہیں)

ایسے لوگ صبر کے حالات میں ٹکراؤ کی سیاست چلائیں گے۔ جہاں چپ رہنا چاہیے وہاں

وہ بولنے کا کمال دکھائیں گے۔ جس موقع کے لیے خدا کا حکم ہوگا کہ خود اپنا احتساب کرو وہاں وہ احتسابِ اقوام اور احتساب کائنات کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں ـــــــ خود بھی ہلاک ہوئے اور انھوں نے دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین تقریباً سب کے سب حضرت علیؓ کے اس قول کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ وہ "ناسخ اور منسوخ" کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ چنانچہ جہاں ناسخ پر عمل کرنا تھا وہاں انھوں نے منسوخ پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ایسے ایسے اقدامات کیے جو غیر حکیمانہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے صرف بربادی کا سبب بنے۔

۱۸۵۷ میں علماء ہند کا انگریزوں سے جنگ کرنا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ علماء کے اس فیصلہ کے مطابق ہزاروں مجاہدین تھانہ بھون (سہارن پور) میں جمع ہو گیے، اور انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد کی باتیں ہونے لگیں۔ اس وقت صرف ایک عالم (مولانا شیخ محمد صاحب) اس مہم کے مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے:

"قصبہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ اس بنا پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے۔ بدقسمتی سے مولانا کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوایا۔ جب ہر دو حضرات پہونچ گیے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔"

(نقش حیات، جلد دوم ۱۹۵۴، صفحہ ۴۱)

مولانا شیخ محمد صاحب کی رائے نہایت درست تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ کے مقابلہ کو بدر کے مقابلہ پر قیاس کرنا بالکل صحیح نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں اور ان کے مخالفین کے درمیان جو فرق تھا وہ باعتبار کمیت (Quantity) تھا۔ جب کہ ۱۸۵۷ کی جنگ کے موقع پر مسلمانوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان فرق باعتبار کیفیت (Quality) پایا جارہا تھا۔ یعنی بدر کے موقع پر تلوار کا مقابلہ تلوار سے تھا۔ جب کہ ۱۸۵۷ کے موقع پر تلوار کا مقابلہ بندوق (بالفاظِ دیگر دستی ہتھیار کا مقابلہ دور مار ہتھیار) سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کے مقابلہ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور ۱۸۵۷ میں مخلص اور متقی مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھیں شکست ہوئی۔

اس معاملہ کو مزید سمجھنے کے لیے غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کا مطالعہ کیجیے۔ فتح مکہ کے فوراً بعد یہ دونوں غزوات پیش آئے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ دونوں غزوات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو الگ الگ طریقے اختیار فرمائے۔ حنین کے موقع پر آپ نے مخالفین سے باقاعدہ جنگ کی۔ اس کے برعکس طائف کے موقع پر صورت حال کا اندازہ کرنے کے بعد آپ لڑائی کیے بغیر واپس چلے آئے۔

قریش کے بعد عرب میں دو بڑے قبیلے، ہوازن اور ثقیف تھے۔ وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ فتح مکہ کے بعد ان قبائل نے اطاعت قبول نہیں کی بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا منصوبہ بنایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ مکہ سے چل کر حنین پہونچے۔ یہاں قبیلہ ہوازن کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ کھلے میدان میں تھا۔ اس مقابلہ میں آخر کار مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

اس کے فوراً بعد آپ نے قبیلہ ثقیف پر چڑھائی کی مگر یہاں صورت یہ تھی کہ قبیلہ ثقیف طائف میں رہتا تھا۔ جو مکمل طور پر حصار میں تھا۔ شہر طائف کے چاروں طرف پتھر کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے براہ راست مقابلہ میں یہ دیواریں حائل ہوگئیں۔ قبیلہ ثقیف کے لوگ دیواروں کے اوپر مورچہ سنبھالے ہوئے تھے اور مسلمان دیوار کے نیچے میدان میں تھے۔ ثقیف والوں نے مسلمانوں پر تیر برسائے مسلمان اس کے باوجود دیوار تک پہونچ گیے۔ تو انھوں نے اوپر سے گرم کیا ہوا لوہا گرانا شروع کیا اس کی وجہ سے بہت سے مسلمان شہید ہوگیے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلم فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

قبیلہ ہوازن سے مسلمانوں کا مقابلہ برابری کا مقابلہ تھا۔ اس لیے وہاں پورا مقابلہ کیا گیا۔ اس

کے برعکس قبیلہ ثقیف سے مقابلہ کے وقت دونوں فریق برابر کی حیثیت میں نہیں تھے۔ ایک فریق زمین پر تھا اور دوسرا فریق قلعہ کی دیواروں پر۔ ایک فریق کے لیے کارروائی کرنے کے راستے بند تھے اور دوسرا فریق اپنی کارروائی کرنے کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر قبیلہ ہوازن سے مقابلہ کیا گیا اور قبیلہ ثقیف سے مقابلہ نہیں کیا گیا۔ ایک قبیلہ کے مقابلہ میں جو چیز "ناسخ" کی حیثیت رکھتی تھی وہ دوسرے قبیلہ کے معاملہ میں "منسوخ" قرار پائی۔

قرآن میں فکر و عمل کا جو معیار بتایا گیا ہے وہ بلاشبہ مستقل ہے۔ مگر عملی تقاضے ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے شخصی مزاج اور اجتماعی احوال میں فرق کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اسی کے لحاظ سے شریعت کے انطباق میں بھی فرق کیا جائے۔ یہ فرق ابدی نہیں ہوتا بلکہ حالات کی بنا پر صرف وقتی ہوتا ہے۔ دین میں اگر یہ حکمت موجود نہ ہو تو وہ ابدی دین نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی دعوتی مہم کو نتیجہ خیز طور پر موجودہ اسباب کی دنیا میں چلایا جا سکتا ہے۔

مثلاً قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف دونوں کے معاملہ میں یکساں طور پر یہ مطلوب تھا کہ انھیں اسلام کے ماتحت لایا جائے۔ مگر انھیں اسلام کے تحت لانے کے لیے آپ نے دو الگ الگ طریقہ اختیار فرمائے۔ ہوازن کے معاملہ میں اگر جنگ مطلوب تھی تو ثقیف کے معاملہ میں جنگ منسوخ قرار پائی۔ اسی طرح ثقیف کے معاملہ میں اگر غیر جنگی طریقہ کار مطلوب تھا تو ہوازن کے معاملہ میں وہ متروک قرار دیدیا گیا۔

ڈاکٹر رین ہولڈ (Dr. Reinhold Niebuhr). نے اپنی ایک پسندیدہ دعا لکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: خدا مجھے وہ متانت دے کہ میں ان چیزوں کو قبول کر سکوں جن کو میں بدل نہیں سکتا۔ وہ مجھے حوصلہ دے کہ میں ان چیزوں کو بدلوں جن کو میں بدل سکتا ہوں۔ اور خدا مجھے وہ عقل دے کہ میں فرق کو جان سکوں:

God grant me the serenity
To accept the things I cannot change;
The courage to change the things I can;
And the wisdom to know the difference.

ڈاکٹر رین ہولڈ نے اسی بات کو فطرت کی زبان میں کہا ہے جس کو حضرت علیؓ نے شریعت کی زبان میں فرمایا۔ اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی دانش مندی یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ اسی "فرق" کو جاننے میں تمام اجتماعی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

# نسخ کی حقیقت

ہندستان ٹائمس (۱۴ اکتوبر ۱۹۸۵) میں صفحہ ۹ پر مسٹر اندرسین شرما کا ایک خط چھپا ہے۔ وہ مسلم نقطۂ نظر کے بارہ میں ایک مطبوعہ خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

> Syed Shahabuddin's letter is misleading. He says that an injunction in the Quran is unchangeable and could not be changed by the Holy Prophet. This is far from truth as many revelations (Ayat) were cancelled and replaced in the changed circumstances.

سید شہاب الدین کا خط غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا ایک حکم ناقابل تغیر ہے اور خود پیغمبر اسلام بھی اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ کیوں کہ قرآن کی بہت سی آیتیں بعد کو منسوخ کر دی گئیں اور بدلے ہوئے حالات میں دوسری آیتیں ان کی جگہ پر لائی گئیں۔

قرآن کی آیتوں میں نسخ کی یہ تشریح صحیح نہیں۔ نسخ کا مطلب کینسل کرنا نہیں ہے۔ یہ تدریج (Gradation) کی ایک صورت ہے۔ یہ دراصل حکمتِ اصلاح ہے نہ کہ کسی حکم کو مستقل طور پر کینسل کر دینا۔

قرآن کا طریقہ تدریجی اصلاح کا طریقہ ہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن جب کسی برائی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اس کے بارہ میں ایک ابتدائی حکم دیتا ہے۔ اس ابتدائی حکم کا مقصد ذہن تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد جزئی عمل کا حکم آتا ہے جو گویا قرآن کا درمیانی حکم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس معاملہ کی آخری آیت اترتی ہے اور پورے عمل کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

اس تدریجی قانون سازی کی ایک مثال شراب ہے۔ قرآن میں ابتداءً جب شراب کے بارہ میں حکم آیا تو صرف اتنا کہا گیا کہ شراب کا گناہ اس کے فائدہ سے زیادہ ہے (البقرہ ۲۱۹) اس کے عرصہ بعد دوسرا حکم ان الفاظ میں آیا کہ جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے لیے مسجد میں نہ آؤ (النساء ۴۳) اس کے ایک عرصہ بعد قرآن کا آخری حکم آیا اور یہ کہا گیا کہ شراب ایک شیطانی فعل ہے، اس لیے تم اس سے مکمل پرہیز کرو (المائدہ ۹۰)

قرآن میں نسخ کی یہ ایک بہت واضح مثال ہے۔ مگر یہ پورا معاملہ حکمتِ تدریج سے تعلق رکھتا

ہے، نہ یہ کہ آخری حکم کے سوا بقیہ تمام آیتیں ہمیشہ کے لیے منسوخ ہو گئیں۔ شراب کے بارہ میں قرآن کا معیاری حکم یہی ہے کہ وہ مکمل طور پر حرام ہے۔ مگر جب کسی سماج میں اس حکم کو نافذ کرنا ہو تو دوبارہ سماج کی حالت دیکھی جائے گی اور حکم کے نفاذ میں دوبارہ اس تدریج کو ملحوظ رکھا جائے گا جو ابتداءً شارع نے اختیار فرمایا تھا۔

## نفاذ شریعت

قرآن کتاب ہدایت بھی ہے اور کتاب دعوت بھی۔ ہدایت ہونے کے اعتبار سے قرآن میں وہ سب باتیں اپنی کامل صورت میں درج ہیں جو انسان کی حقیقی صلاح و فلاح کے لیے ضروری ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن نے کسی چیز کو ادھورا نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ ہر چیز کو کامل طور پر بیان کر دیا ہے۔

مگر دعوت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیوں کہ دعوت میں مدعو کے حالات کی رعایت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ یہی دوسرا پہلو ہے جس نے قرآن میں "نسخ" کا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ بیانِ ہدایت کے پہلو سے قرآن معیار اعلیٰ کو سامنے رکھتا ہے۔ مگر دعوت و اصلاح کے پہلو سے اس میں یہ ابدی رہنمائی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ لوگوں کے مزاج کی رعایت سے کس طرح تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا جائے اور حالات کے فرق سے کس طرح احکام کے نفاذ میں فرق کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں یہ مہم چل رہی ہے کہ شریعت کے قوانین کو حکومت کی طاقت سے جاری و نافذ کیا جائے۔ مگر اس قسم کی تمام کوششیں اب تک سراسر بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یہ تمام تحریکیں "نسخ" کی حکمت کو ملحوظ رکھے بغیر چلائی جا رہی ہیں۔

اسلامی قانون کو نافذ کرنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے حق میں ذہنی فضا تیار کی جائے۔ جب معاشرہ کی قابل لحاظ تعداد ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو جائے تو قانون کو جزئی طور پر نافذ کیا جائے۔ پھر جیسے جیسے استعداد میں اضافہ ہو قانون کے مزید اجزاء نافذ کیے جائیں۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے پورا قانون اپنی آخری شکل میں نافذ کر دیا جائے۔

شریعت کی یہی خاص حکمت ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان لفظوں میں بیان فرمایا:

انما نزل اول ما نزل سورۃ من المفصل — قرآن میں پہلے وہ مفصل سورتیں اتاری گئیں جن میں

فیھا ذکر الجنۃ والنار۔ حتیٰ اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدًا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدًا۔

(بخاری باب تالیف القرآن)

جنت اور جہنم کا بیان ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے لیے ہموار ہو گیے تو حلال و حرام کے احکام اترے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر یہ اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

شریعت کی یہ حکمت قرآن سے اور سیرت رسول سے انتہائی واضح ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے پرجوش اسلامی قائدین اس شرعی حکمت کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور اسی لیے وہ ناکام رہے۔

ستمبر ۱۹۸۳ میں سوڈان میں سابق صدر نمیری اور الاخوان المسلمون نے ملک میں کامل شراب بندی کا اعلان کیا۔ انھوں نے بعض دکانوں پر چھاپہ مار کر شراب کی کچھ بوتلیں حاصل کیں۔ اور ان کو توڑ کر ان کی شراب دریائے نیل میں بہادی۔ مگر اس کے بعد یہ منظر دیکھنے میں نہیں آیا کہ دورِ نبوت کے مدینہ کی طرح سوڈان کی سڑکوں اور گلیوں میں بھی شراب بہائی جانے لگے۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام نے تدریج کے اصول پر شراب کو بند کیا تھا۔ جب کہ سوڈان کے اسلامی لیڈروں نے اچانک شراب کو بند کرنا چاہا۔ چنانچہ وقتی تالیوں کی گونج اور چند دن کی اخباری سرخیوں کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہو سکا۔ صرف ایک سال بعد سوڈان کی "اسلامی حکومت" ختم ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ اس کے اسلامی احکام بھی۔

یہی حال موجودہ زمانہ میں ان تمام مسلم ملکوں کا ہوا ہے جہاں انقلابی مسلم لیڈروں نے اسلامی قوانین کو نافذ کرنا چاہا۔ اسلام کی حکمتِ نسخ کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ان کی تمام کوششیں صد فی صد ناکام ہو کر رہ گئیں۔ لفظی ہنگاموں کے سوا ان کے حصہ میں اور کچھ نہ آیا۔

## سید احمد شہید کی مثال

مسلمان پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے اسی ناکام کہانی کو دہرا رہے ہیں۔ وہ "نسخ" کے قرآنی اصول پر عمل کیے بغیر اقدام کرتے ہیں اور پھر سراسر ناکام رہتے ہیں۔

اس سلسلہ کا پہلا نمایاں واقعہ سید احمد شہید بریلوی (۱۸۳۱ - ۱۷۸۵) کی وہ تحریک تھی جس کو

عام طور پر تحریک مجاہدین کہا جاتا ہے۔ وہ یوپی، بہار اور بنگال سے اپنے معتقدین کو لے کر پنجاب پہونچے۔ وہاں انھوں نے پشاور کو "فتح" کیا اور اس میں اسلامی قانون کی حکومت قائم کر دی۔

مگر یہ اسلامی حکومت بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کے اوپر اسلامی قانون کی حکومت قائم کی گئی وہ اگرچہ نسلی طور پر مسلمان تھے مگر اسلامی قانون کو قبول کرنے کا مزاج ان کے اندر بالکل پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ مقامی مسلم آبادی سید صاحب کے عمال کی باغی ہو گئی۔ وہاں کے قبائلی سرداروں نے سید صاحب کے آدمیوں کو قتل کر ڈالا، اور خود سید صاحب کا یہ حال ہوا کہ انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے انتہائی غیر حکیمانہ جنگ چھیڑ دی اور اس میں لڑتے ہوئے ۶ مئی ۱۸۳۱ کو قتل کر دیئے گیے۔ اسلامی حکومت بننے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

ایک مورخ نے سید احمد شہید بریلوی کے حالات لکھتے ہوئے آخر میں حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

"مجاہدین کی اکثریت صرف نعرۂ جہاد پر جمع ہو گئی تھی۔ ان کی تربیت نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے اسلامی حکومت کو چلانے کی ذمہ داری سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ انھوں نے جس علاقہ میں اسلامی حکومت قائم کی وہاں کے عوام کے ذہن کو پہلے اس کے لیے تیار نہ کیا۔ سید صاحب کی حکومت نے اسلامی قانون کو نافذ کرتے ہوئے تدریج کا خیال نہ رکھا اور سارا اسلامی قانون فوراً نافذ کر دیا۔ اس سے عوام کے اندر اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔"

تاریخ پاکستان و ہند۔ از شیخ محمد رفیق ایم اے، لاہور ۱۹۷۲، صفحہ ۳۳۵

مسلمانوں کے پرجوش لیڈروں کو نہ قرآن و سنت سے ہدایت ملی اور نہ ماضی اور حال کے واقعات ان کی آنکھ کھولنے والے ثابت ہوئے۔ وہ ایک ہی ناکام کہانی کو ڈیڑھ سو سال سے مسلسل دہرائے چلے جا رہے ہیں۔

# اسلوب کلام

شاعری کی بنیاد تخئیل پر ہے۔ تخئیل میں کوئی خارجی چیز آدمی کی سوچ کی حد بندی کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ اسی لیے شاعر خیالی پرواز میں جو چاہتا ہے کہتا چلا جاتا ہے (الم تر انھم فی کل واد یھیمون)

اس کے برعکس سائنس کی بنیاد فطرت پر ہے۔ فطرت (Nature) ایک متعین حقیقت کا نام ہے۔ فطرت کی دنیا میں تمام واقعات انتہائی معلوم اور متعین اصولوں کی بنیاد پر ظہور میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس داں کی زبان شاعر کی زبان سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ شاعر کو لفظوں کے انتخاب میں احتیاط کی ضرورت نہیں۔ اس کی فکری اڑان اس سے کچھ بھی کہلوا سکتی ہے۔ مگر سائنس داں انتہائی محتاط زبان استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ وہ سختی کے ساتھ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کی زبان میں فنی صحت اور ریاضیاتی قطعیت موجود ہو۔

جدید سائنس کا ظہور یوروپ میں ہوا اور وہیں اس کی ترقی ہوئی۔ پچھلے کئی سو سال کا زمانہ ایسا ہے جب کہ مغربی دنیا میں سائنس کو سب سے زیادہ غلبہ حاصل رہا ہے۔ مغرب کی جدید تہذیب مکمل طور پر سائنس کے زیر اثر بنی ہے۔ اسی کے اثر سے مغرب کی زبانوں میں محتاط اسلوب اور حقیقت نگاری کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔

سائنس داں جس شعبۂ علم میں کام کرتا ہے اس کے عین تقاضے کے طور پر وہ ایسا کرتا ہے کہ اپنے خیالات کو محتاط زبان (Gaurded language) میں ظاہر کرتا ہے۔ جب مغربی انسان کے نزدیک سائنس کی اہمیت بڑھی تو اسی کے ساتھ قدرتی طور پر یہ ہوا کہ زبان میں وہی طرز پسند کیا جانے لگا جو سائنس دانوں کا طرز تھا۔ اس طرح وہ زبان وجود میں آئی جس کو ہم نے محتاط زبان کا نام دیا ہے۔

محتاط زبان سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت کے لیے چند مثال لیجئے:

۱۔ ریمزے میکڈونلڈ (۱۹۳۷-۱۸۶۶) ایک برطانی لیڈر تھے جو بعد کو وہاں کے وزیر اعظم بنے ان کو عوامی تقریروں کا خاص ملکہ تھا جس میں معنی کم اور الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق انگلینڈ کی لیبر پارٹی سے تھا جو سر ونسٹن چرچل کی حریف تھی۔ چنانچہ لارڈ ونسٹن چرچل نے ایک بار ریمزے میکڈونلڈ پر طنز کرتے ہوئے کہا:

He is a man with the gift of compressing the largest amount of words into the smallest amount of thoughts.

وہ ایک ایسے آدمی ہیں جو اس بات کا خصوصی ملکہ رکھتے ہیں کہ الفاظ کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو خیالات کی کم سے کم مقدار میں کھپا سکیں۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب آزادیٔ ہند (India Wins Freedom) کا ایک باب منقسم انڈیا (Divided India) ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں کہ ہندستان کے لوگ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی صبح کو سو کر اٹھے تو ہندستان آزاد ہو چکا تھا۔ مگر ہماری آزادی اسی کے ساتھ ہمارے لیے ایک المیہ بھی لائی۔ دہلی میں آگ اور خون کا بازار گرم ہو گیا۔ مسلمان ہر طرف مارے جا رہے تھے اور ان کی جائدادیں تباہ کی جا رہی تھیں۔

اس وقت سردار ولبھ بھائی پٹیل مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ تھے۔ دہلی کے مسلمانوں کے اوپر ہر روز جو حملے ہو رہے تھے اس کی توجیہہ سردار پٹیل نے یہ پیش کی کہ یہ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے بچاؤ کا اقدام ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی سے خطرناک ہتھیار برآمد ہوئے ہیں۔ دہلی کے مسلمانوں نے یہ ہتھیار اس لیے جمع کیے تھے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کریں۔ اگر ہندو اور سکھ پہل نہ کرتے تو مسلمان ان کو تباہ کر دیتے۔

پولیس نے قرول باغ اور سبزی منڈی کے علاقوں میں مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی تھی اور کچھ "ہتھیار" برآمد کیے تھے۔ سردار پٹیل کے حکم سے یہ ہتھیار گورنمنٹ ہاؤس لائے گیے اور ہمارے معائنہ کے لیے کیبنٹ روم کے پاس ایک چیمبر میں رکھے گیے۔ جب ہم لوگ جمع ہوئے تو سردار پٹیل نے کہا کہ ہم کو سب سے پہلے چیمبر میں چلنا چاہیے اور وہاں مسلم گھروں سے برآمد کیے ہوئے ہتھیاروں کو دیکھنا چاہیے۔ ہم وہاں پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ میز کے اوپر کئی درجن چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سبزی کاٹنے کی یا قلم بنانے کی یا جیبی چھریاں تھیں۔ ان میں بہت سی زنگ آلود تھیں۔ کنتوں کا دستہ ٹوٹا ہوا تھا۔ کچھ معمولی قسم کے لوہے کے چھرّے یا لوہے کے ٹکڑے تھے۔ کچھ ٹوٹے ہوئے پانی کے پائپ تھے۔

سردار پٹیل کے مطابق یہ وہ ہتھیار تھے جن کو دہلی کے مسلمانوں نے اس لیے جمع کیا تھا تاکہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کا خاتمہ کر سکیں۔ لارڈ ماؤنٹ بٹین (آزاد ہندستان کے پہلے گورنر جنرل) نے

ان میں سے ایک یا دو چاقو اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور مسکراتے ہوئے بولے :

Those who had collected this material seemed to have a wonderful idea of military tactics if they thought that the city of Delhi could be captured with them.

Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, Orient Longmans, Bombay, 1959, p. 215

وہ لوگ جنھوں نے یہ سامان جمع کیا تھا ان کا فوجی نظریہ بڑا عجیب ہوگا اگر انھوں نے سمجھا کہ اس کے ذریعہ سے دہلی کے شہر پر قبضہ کیا جا سکتا ہے ۔

# جھوٹی لیڈری

صبح اٹھ کر ہر روز جو آوازیں راقم الحروف کے کان میں آتی ہیں ان میں سے ایک آواز اس پھیری والے کی ہے جو روزانہ سڑک سے یہ آواز لگاتا ہوا گزرتا ہے:

کباڑی ... ردی والا، کباڑی ... ردی والا

جب میں یہ آواز سنتا ہوں تو اکثر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ شخص بھی کس قدر حقیقت پسند ہے۔ وہ کباڑی والا ہے تو اپنے کو کباڑی والا ہی بتاتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنی زبان سے "جوہری" اور "سونے چاندی والا" کی آواز بھی نکال سکتا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ وہ کباڑی ہے، جوہری نہیں ہے۔ اس لئے حقیقت کے بازار میں اس کو صرف کباڑی کی قیمت ملے گی، اس کو جوہری کی قیمت نہیں مل سکتی۔ اگر وہ سڑکوں پر جوہری، جوہری پکارے تو سارا دن گزر جائے گا اور وہ ایک پیسہ کا کاروبار بھی نہ کر سکے گا۔

یہی تمام کاموں کا معاملہ ہے۔ ہر کام میں آدمی اپنی اصل حیثیت کے مطابق قیمت پاتا ہے۔ مگر لیڈری کا کام اس سے مستثنیٰ ہے۔ لیڈری کی دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آپ حقیقۃً کباڑی ہوں اور جوہری کی آواز لگائیں۔ پھر بھی آپ کو ایسے معتقدین مل جائیں جو آپ کو مفکر اسلام تصور کریں، جو آپ کو نجات دہندۂ قوم کا لقب دیدیں۔

لیڈری کی دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آدمی کے اندر ایک معمولی اخبار چلانے کی طاقت نہ ہو اور وہ انسانیت بچاؤ کا جھنڈا بلند کرے۔ وہ ایک مدرسہ کا انتظام درست نہ کر سکتا ہو اور "سنو اے اہل عالم" کے عنوان پر تقریر کرے۔ ووٹ دینے والے عوام کے اندر اس کا کوئی مقام نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا نعرہ لے کر الکشن کے میدان میں کود پڑے۔

بائبل میں "جھوٹے نبی" کا لفظ آتا ہے۔ اس سے مراد اسی قسم کے جھوٹے لیڈر ہیں۔ ایسے لوگ ممکن ہے کسی قسم کی وقتی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیں۔ مگر حقیقت کی نظر میں وہ صرف مجرم ہیں۔ کیونکہ اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے وہ کباڑی تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو جوہری کے روپ میں پیش کیا۔ انھوں نے قوم کو صرف بے راہ کیا اور نعرہ یہ لگایا کہ وہ قوم کو راستہ دکھانے کے لیے اٹھے ہیں۔

## خبرنامہ اسلامی مرکز۔ ۱۵

۱۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلامی عبادت کے موضوع پر قرآن کی روشنی میں ۴۵ منٹ کی گفتگو کی۔ حاضرین میں بہت سے نئے نئے لوگ شامل تھے۔

۲۔ ہالینڈ میں ایک اسلامی مرکز ہے جس کا نام اور پتہ یہ ہے:

Moslim Informatie Centrum
Beeklaan 207, Postbus 61217, 2506 AE Den Haag, Holland

اس کے ایک ذمہ دار (Abdoel Qayyoum Boedhoe) ۲۷ اکتوبر کو مرکز میں آئے۔ انھوں نے مرکز کے پروگرام سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کی دلچسپی کے پیش نظر الرسالہ انگریزی ان کے نام جاری کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہالینڈ میں کثرت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس وقت اسلام ہالینڈ کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے۔

۳۔ عربی پریس میں اسلامی مرکز کے افکار مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (۲۸ اکتوبر ۱۹۸۵) میں صدر اسلامی مرکز کا ایک مضمون خصوصی طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الدعوۃ الاسلامیہ فی العصر الحدیث۔ اسی طرح ماہنامہ البلاغ (کویت) کی اشاعت ۲۴ رجب ۱۴۰۰ھ میں صدر اسلامی مرکز کی عربی کتاب حکمۃ الدین کا لمبا اقتباس نمایاں طور پر شائع کیا گیا ہے اور آخر میں یہ الفاظ درج ہیں: نقلاً عن کتاب "حکمۃ الدین" للکاتب الہندی الکبیر وحید الدین خان۔

۴۔ ہندستان کے ایک بڑے شہر میں ایک مسجد غیر مسلم محلہ میں واقع ہے۔ یہاں کے غیر مسلم صاحبان نے مطالبہ کیا کہ صبح کی نماز کی اذان لاوڈ اسپیکر پر نہ دی جائے۔ اس مسئلہ پر کافی تناؤ پیدا ہو گیا۔ حسب معمول مسلمانوں میں ایسے نوجوان اٹھے جنھوں نے کہا کہ ہم جیل جائیں گے مگر لاوڈ اسپیکر کو بند نہیں کریں گے۔ یہ قصہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے کچھ سنجیدہ لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ صدر اسلامی مرکز کو خط لکھا جائے اور ان کی رائے لی جائے۔ وہ جو رائے دیں اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس کے مطابق صدر اسلامی مرکز نے وہاں کے مسلمانوں کو ایک خط لکھا جس میں انھیں یہ مشورہ دیا کہ فی الحال وہ برادران وطن کے مطالبہ کو مانتے ہوئے صبح کی اذان بغیر

لاؤڈ اسپیکر دینا منظور کرلیں۔ شہر کے سنجیدہ افراد نے اس خط کو پسند کیا۔ اس کی فوٹو کاپی نکلوا کر مسلمانوں میں تقسیم کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خدا کے فضل سے مسلمانوں کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ راضی ہو گیے کہ فجر کی نماز کی اذان لاوڈ اسپیکر پر نہ دیں گے۔ اس طرح ایک فساد ہوتے ہوتے رہ گیا جس کے نتائج کا اندازہ کرنا قارئین کے لیے مشکل نہیں۔

۵۔ الرسالہ ماہ نومبر ۱۹۸۵ میں ایک مضمون بعنوان "نکاح اور طلاق" چھپا ہے۔ یہ مضمون ہر جگہ بہت پسند کیا گیا ہے۔ مختلف جرائد نے بھی اس کو اپنے صفحات میں شائع کیا ہے۔ مثلاً ہفت روزہ نئی دنیا ۱۱ نومبر ۱۹۸۵ اور ہفت روز بلٹز ۲ نومبر ۱۹۸۵ روزنامہ منصف حیدر آباد ۴ نومبر ۱۹۸۵، وغیرہ۔

۶۔ اسلامی مرکز کا خاص مقصد عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرنا ہے۔ خدا کے فضل سے اس مقصد میں اسلامی مرکز کو اس حد تک کامیابی حاصل ہو چکی ہے کہ آج دنیا کے کسی بھی اسلامی ادارہ کے پاس عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود نہیں جو اسلامی مرکز کے پاس ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ حال ہو چکا ہے کہ جو شخص بھی اسلامی دعوت کو عصری اسلوب میں پیش کرنا چاہتا ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اسلامی مرکز کی مطبوعات سے استفادہ کرے۔ اگرچہ قوم کے اندر اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے یہ کام زیادہ تر بلا اعتراف ہو رہا ہے۔ اس کی مثالیں ہر روز مختلف انداز سے سامنے آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر ہفت روزہ تعمیر حیات (لکھنؤ) کے ایک مضمون میں الرسالہ کی ایک لمبی عبارت شامل کر لی گئی ہے جب کہ اس میں نہ الرسالہ کا حوالہ ہے اور نہ اس کے لکھنے والے کی حیثیت سے صدر اسلامی مرکز کا نام درج ہے۔ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الرسالہ جولائی ۱۹۸۵ صفحہ ۲۴-۲۳ اور تعمیر حیات ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ صفحہ ۱۱

۷۔ ڈاکٹر کرسٹین ڈبلیو ٹرال (برلن ۱۹۳۷) ایک جرمن مستشرق اور پادری ہیں۔ ان کی مرتب کردہ ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ایک انگریزی کتاب چھپی ہے جس کا موضوع ہے "ہندستان میں اسلام"۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے: دین کے بارہ میں تین ممتاز علماء کا خیال:

The Meaning of Din: Recent views of Three Eminent Indian Ulama

اس عنوان کے تحت مختصراً مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دینی تصور کا ذکر

ہے اور پھر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ "مولانا وحید الدین خاں" کے دینی تصور کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام و پتہ حسب ذیل ہے :

*Islam in India: Studies and Commentaries*
Edited by Dr. Christian W. Troll
Vikas Publishing House Pvt. Ltd., New Delhi 110002
pp. 231, Price Rs. 95.00

۸۔ نانڈیڑ سے ایک صاحب کیسٹ کے بارہ میں لکھتے ہیں :

الرسالہ کیسٹ کو یہاں پر سب لوگ پسند کیے ہیں اور دعا دے رہے ہیں کہ مولانا وحید الدین کی آواز نہیں وہ بلکہ خدائی آواز ہے۔ ہم سب دعا کرتے ہیں کہ ہر گھر میں یہ آواز سنائی دے یہی میری اللہ سے عرض ہے (۱۸ اکتوبر ۱۹۸۵)

۹۔ ایک صاحب نوادہ (بہار) سے لکھتے ہیں : محترم بزرگ کی تصنیف زلزلۂ قیامت ابھی پڑھ کر ختم کی ہے۔ جزاک اللہ فی الدارین خیرا۔ یہ کتاب اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے خود ایک زلزلہ ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظر سے گزرے۔ میں یہ کتاب یہاں دوسروں کو دے رہا ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو معلومات نہیں ہیں۔ عام طور پر قیامت حشر اور حساب و کتاب سے مسلمان واقف ہیں۔ مگر اسی بات کو مولانا محترم کے اسلوب اور انداز بیان نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ اثر آفرینی اور تاثیر کی کوئی حد نہیں (۲۲ اکتوبر ۱۹۸۵)

یہ دو خط بطور نمونہ یہاں نقل کیے گیے ہیں۔ اس قسم کے خط ہم کو ہر روز برابر موصول ہوتے ہیں۔

۱۰۔ نیویارک (امریکہ) میں مختلف مذاہب کی ایک بین اقوامی کانفرنس نومبر ۱۹۸۵ میں ہوئی صدر اسلامی مرکز کو بھی اس کانفرنس میں اسلام کی نمائندگی کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق انھوں نے اس بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ اور اپنا مقالہ اسلام کے موضوع پر پیش کیا۔ اس کا تفصیلی حال انشاء اللہ روداد سفر کے تحت الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۱۱۔ پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ کتاب کا انگریزی نام یہ ہے :

*MUHAMMAD: The Prophet of Revolution*

۱۲۔ مذہب اور جدید چیلنج کا عربی ترجمہ (الاسلام یتحدی) اس سے پہلے عرب ملکوں میں چھپتا رہا ہے اب وہ مکتبہ الرسالہ سے بھی چھپ گیا ہے۔ شائقین اس کو یہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

# ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

## ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

## زر تعاون الرسالہ

| | |
|---|---|
| زر تعاون سالانہ | ۳۶ روپیہ |
| خصوصی تعاون سالانہ | ۲۰۰ روپیہ |

بیرونی ممالک سے

| | |
|---|---|
| ہوائی ڈاک | ۲۰ ڈالر امریکی |
| بحری ڈاک | ۱۰ ڈالر امریکی |

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

# الرسالہ
## کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی شروع ہوگئی ہے

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

January 1986
Number 110

# AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128


# الرسالہ
# کیسٹ

## ماہانہ کیسٹ سیریز

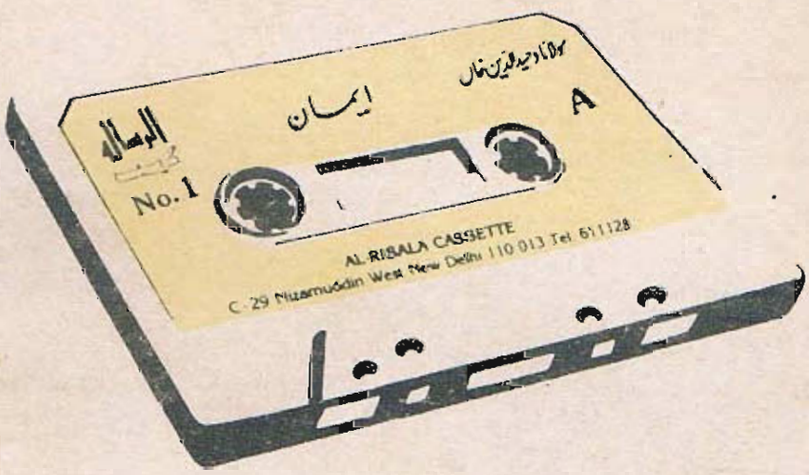


## عصری اسلوب میں
## اسلامی تعلیمات

مولانا وحید الدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ — ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ — سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی — ۲۵ ڈالر امریکی — ۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں
الرسالہ کیسٹ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013


Rs 3.00